خانۂ تکلّم

(انٹرویز)

اکرم نقاش

KHAANA-E-TAKALLUM

Interviews by

Akram Naqqash

©	:	محفوظ
کتاب	:	خانۂ تکلّم (انٹرویوز)
انٹرویونگار	:	اکرم نقاش
اشاعت	:	2016
تعداد	:	500
قیمت	:	**-/300 روپے**
لائبریری ایڈیشن	:	**-/400 روپے**
سرورق	:	سید مشتاق فاروق
کمپوزنگ	:	حسن محمود۔9844604101
ناشر	:	افلاک پبلی کیشنز، گلبرگہ
پتہ	:	وہائٹ ہاؤز، نیو بنک کالونی، بلال آباد، گلبرگہ۔585104
موبائل	:	9845390893
ای میل	:	akramnaqqash61@yahoo.com

اس کتاب کی اشاعت میں کرناٹک اُردو اکاڈمی بنگلور کی جزوی مالی اعانت شامل ہے۔

خلیل مامون کے نام

فہرست

- کچھ ان انٹرویوز کے بارے میں — اکرم نقاش — 07

انٹرویوز

- شمس الرحمٰن فاروقی سے مکالمہ — 09
- گوپی چند نارنگ سے مکالمہ — 37
- وارث علوی سے مکالمہ — 59
- فضیل جعفری سے مکالمہ — 73
- محمد علوی سے مکالمہ — 83
- ندا فاضلی سے مکالمہ — 103
- بشر نواز سے مکالمہ — 117
- بلراج کومل سے مکالمہ — 137
- خلیل مامون سے مکالمہ — 145
- اکرام باگ سے مکالمہ — 169
- خالد جاوید سے مکالمہ — 185

کچھ اِن انٹرویوز کے بارے میں

اس کتاب میں شامل انٹرویوز کی شروعات 2009 میں ہوئی اور یہ سلسلہ 2016 تک چلتا رہا۔انٹرویوز کے لیے میری فہرست میں دوتین اوراہم نام بھی شامل تھےلیکن بہ وجوہ یہ فہرست مکمل نہ ہوسکی جس کا مجھے خلق ہے اور دل اس بات سے بھی ملول وسوگوار ہے کہ اس کتاب میں شامل چند شخصیات اب ہمارے درمیان نہیں رہیں۔اللہ انھیں غریقِ رحمت کرے۔

ایک دن خلیل مامون صاحب کا فون آیا(اُن دنوں وہ کرناٹک اُردو اکاڈمی بنگلور کے صدرنشین تھے)انھوں نے کہا کہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب اکاڈمی کے جلسے میں شرکت کے لیے بنگلور آرہے ہیں، میں چاہتا ہوں آپ اُن سے انٹرویو کریں۔میں نے قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ حامی بھرلی۔اس طرح بنگلور میں یہ انٹرویو کیا گیا۔اس کے بعد بلراج کومل،فضیل جعفری اور گوپی چند نارنگ صاحب کی اکاڈمی کے جلسوں میں بنگلور آمد پر یہ انٹرویو ہوتے رہے۔اسی طرح مختلف مراحل میں دیگر زعمائے ادب سے مکالمہ قائم ہوتا رہا۔

میرے لیے یہ بات باعثِ مسرت ہے کہ ادب کے میدان کی ان سرکردہ ہستیوں نے میری درخواست کوشرفِ قبولیت بخشا اور انٹرویوز کے لیے آمادگی ظاہر کی۔میں نے بساط بھرکوشش کی ہے کہ انٹرویوز میں ایسے سوالات قائم کیے جائیں جوادب کی افہام وتفہیم اورادب کی سمت ورفتار کی نشاندہی میں مددگار ثابت ہوں،شخصی اور روایتی نوع کے سوالات کم کم کیے اور ادبی مسائل پر مفصل گفتگو کے امکانات کی تلاش پر زیادہ زور دیا۔

کتاب میں شامل جتنی شخصیات سے انٹرویوز کیے گئے ہیں وہ سبھی جدیدیت اور جدید ادب کے بنیاد گذار اور علم بردار رہے ہیں،سواُن سے جدیدیت کے موضوع پر زیادہ استفسار کیا گیا۔دو ایک سوال ایسے بھی ہیں جن کی تکرار اس لیے بھی ضروری سمجھی گئی کہ کسی ایک مسئلے پر مختلف شخصیات کے نقطۂ نظر کو سمجھا جاسکے۔

میرے کچھ احباب کا خیال ہے کہ ان انٹرویوز کی نوعیت بالکل مختلف اور off the track ہے پتہ

نہیں یہ تحسین کا پہلو ہے یا تقبیح کا،لیکن لفظ ’’مختلف‘‘ میرے لیےطمانیت کا باعث ہے۔

فن کاروں کے تعارف کے سلسلے میں ایک بات عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ پہلے میں نے طئے کیا تھا کہ انٹرویوز سے پہلے ان ادیبوں پر اپنا نوٹ دیا جائے، یہ کام مکمل بھی تھا،لیکن میرے ایک کرم فرما نے توجہ فرمائی کہ انٹرویونگار غیر جانب دار ہوتا ہے۔اگر میں اپنا نوٹ انٹرویو سے پہلے دیتا ہوں تو انٹرویوز کی معروضیت کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے کہ یہ ہر صورت اپنی ترجیحات وتعریضات کا در آنا لازمی تھا۔لہٰذا اس خیال کو موقف کرتے ہوئے تحقیقی اہمیت کے پیش نظر صرف سوانحی کوائف، کتابوں اور انعامات واعزازات کی تفصیل پر اکتفا کیا گیا۔

ان انٹرویوز کی نوعیت شخصی، ٹیلی فونک اور مکتوبی ہے۔مکتوبی انٹرویوز میں ممکن ہے قاری کو کہیں کہیں تشنگی کا احساس ہو،تاہم کوشش یہ رہی ہے کہ سوال اس نوع کے ہوں اور مفصل ہوں کہ نفسِ مضمون کا بھر پور احاطہ ہوسکے۔اس کوشش میں میں کس حد تک کامیاب ہوسکا ہوں یہ فیصلہ قارئین کریں گے، میں نے تو بس ان مقتدر شخصیات سے مکالمہ کو اپنی تسکین کا سامان سمجھا اور خود کو سرشار کیا۔

ان انٹرویوز کے لیے میں خلیل مامون صاحب کا بے حد شکر گذار ہوں کہ ان کی تحریک پر ہی یہ سلسلہ شروع ہوا اور کتابی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔اس ضمن میں اپنے دوست سہیل اختر کا شکریہ ادا کرنا بھی میرے لیےضروری ہے کہ ان کے مخلصانہ اصرار کے باعث یہ کتاب جلد شائع ہوسکی۔کرناٹک اُردو اکاڈمی بنگلور کے اربابِ مجاز کا بھی شکر گذار ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کی اشاعت کے لیے مالی امداد سے نوازا۔

اکرم نقاش

شمس الرحمن فاروقی

نام : شمس الرحمٰن فاروقی
پیدائش : 30؍ستمبر 1935 الہ آباد۔اُتر پردیش
تعلیم : ایم۔اے(انگریزی)الہ آباد یونیورسٹی
مصروفیت: 1)انڈین پوسٹل سروِیس، پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدے سے حسنِ خدمت پر سبکدوشی 1994ء
2)چیف ایڈوائزر اور مدیر ماہ نامہ شب خون الہ آباد 2005-1966
3)اعزازی پروفیسر ساؤتھ ایشیا ریجنل اسٹڈیز سنٹر یو ایس اے 1991-2004
4)وائس چیرمین این سی پی یو ایل نئی دہلی 2005-2008
تصنیفات وتالیفات: 1) لفظ ومعنی (مضامین) 1968ء
2) فاروقی کے تبصرے 1968ء
3) شعر،غیر شعر اور نثر (تنقیدی مضامین) 1973ء
4) افسانے کی حمایت میں (تنقیدی مضامین) 1982ء
5) تنقیدی افکار (تنقیدی مضامین) 1984ء
6) اثبات ونفی (تنقیدی مضامین) 1986ء
7) تفہیمِ غالب 1989ء
8) شعرِ شور انگیز (چار جلدیں) 1994ء
9) اندازِ گفتگو کیا ہے (مضامین) 1993ء
10) اُردو غزل کے اہم موڑ (مضامین) 1997ء
11) داستانِ امیر حمزا: زبانی بیانیہ، بیان کنندہ اور سامعین 1998ء
12) اُردو کا ابتدائی زمانہ: ادبی تہذیب وتاریخ کے پہلو 1999ء
13) ساحری، شاہی، صاحب قرانی (چار جلدیں) 2000ء تا 2011ء

14) غالب پر چار تحریریں (طویل مضامین) 2001ء
15) غالب: چند پہلو (مضامین) 2001ء
16) اکبرالہ آبادی، نئی تہذیبی سیاست اور بدلتے ہوئے اقدار 2003ء
17) خورشید کا سامانِ سفر (اقبال پر مضامین) 2007ء
18) جدیدیت کل اور آج (مضامین) 2007ء
19) صورت ومعانیٔ سخن (تنقیدی مضامین) 2010ء
20) معرفتِ شعرِ نو (تنقیدی مضامین) 2010ء
21) تخلیق، تنقید اور نئے تصورات (منتخب مضامین) 2011ء
22) ہمارے لیے منٹو صاحب 2013ء
23) The Secret Mirror(انگریزی) 1981ء
24) Early Urdu Literary Culture and History
25) The Power Politics of Culture: Akbar Ilahabadi and the Changing order of Things
26) How to read Iqbal? 2005ء
27) عروض، آہنگ اور بیان 1977ء
28) درسِ بلاغت 1981ء
29) لغاتِ روزمرہ 2003ء
30) گنجِ سوختہ (شاعری) 1969ء
31) سبز اندر سبز (شاعری) 1974ء
32) چار سمت کا دریا (شاعری) 1977ء
33) آسماں محراب (شاعری) 1996ء
34) The Colours of Black Flowers (selected poem 1959-2001) 2002 انتخاب بیدار بخت

35) سواراوردوسرے افسانے (فکشن) 2001ء
36) کئی چاند تھے سرِ آسماں (ناول) 2006ء
37) The Mirror of Beauty ترجمہ: کئی چاند تھے سرِ آسماں
38) کئی چاند تھے سرِ آسماں ترجمہ: ہندی
39) نئے نام (تالیف) 1967ء
40) شعریات (ترجمہ: ارسطو کی بوطیقا) 1980ء

نوٹ: شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی تا حال قریب قریب 100 کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں اُن میں سے کچھ کتابوں کی تفصیل اوپر دی گئی ہے۔

انعامات واعزازات: 1) پدم شری 2009ء برائے ادبی خدمات
2) ستارۂ امتیاز برائے اُردو خدمات 2010 (حکومتِ پاکستان)
3) سرسوتی سمان 1996ء برائے شعر شور انگیز
4) اعزازی ڈی لٹ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی 2002
5) اعزازی ڈی لٹ، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی حیدرآباد 2007
6) آل انڈیا میرا کاڈمی ایوارڈ ''اعزازِ میر'' 1992ء
7) ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ برائے تنقیدی افکار 1986ء
8) سدھ بندو سمان گورکھ پور، برائے تنقید 2011ء
9) اُتر پردیش اُردو اکاڈمی ایوارڈ 1972، 1974، 1978، 1991
10) اُردو مرکز انٹرنیشنل لاس اینجلس اثر لکھنوی ایوارڈ 2009ء
11) وشو بھارتی کلانکیتن الہ آباد، ساہتیہ شرومنی ایوارڈ 2011ء
12) میرا فاؤنڈیشن الہ آباد ایوارڈ برائے تنقید 2013ء

نوٹ: شمس الرحمٰن فاروقی جن انعامات واعزازت سے سرفراز ہوئے ان کی تعداد قریب 50 ہے جن میں سے کچھ اعزازات کی تفصیل اوپر دی گئی ہے۔

رابطہ : 09415340662

شمس الرحمٰن فاروقی سے ایک مکالمہ

اکرم نقاش : آپ محمود ایاز میموریل لکچر کے ضمن میں بنگلور تشریف لائے ہیں تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلا سوال محمود ایاز کے بارے میں ہی کیا جائے۔محمود ایاز ایک معتبر ادبی صحافی، مستند شاعر اور صاحب نظر نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں۔آپ ان کی شخصیت کو کس حیثیت سے دیکھتے ہیں؟

شمس الرحمٰن فاروقی : میں ہی کیا، میں سمجھتا ہوں جدید ادب کا ہر طالب علم محمود ایاز کو سب سے پہلے ''سوغات'' کے مدیر اور نئی شاعری کے فروغ میں بہت اہم، بنیادی کارنامہ انجام دینے والے شخص کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔اور ہم لوگوں نے تو گویا جب کام شروع کیا لکھنے پڑھنے کا،تو اس وقت محمود ایاز کا پرچہ منظر عام پر آچکا تھا۔''سوغات'' 1959 میں نکلا،اور اس کا اثر دور دور تک پھیل رہا تھا۔اور اگر چہ ان کے خیالات پر ترقی پسند خیالات کا اثر تھا اور آخر تک رہا بلکہ میرے خیال میں یہ اثر آخر میں اور بڑھ بھی گیا تھا،لیکن وہ اس بات سے واقف تھے کہ ادب میں کوئی بھی منظر مستقل نہیں ہوتا۔اور اگر کوئی تحریک ہو، خاص طور سے جس کا تعلق کسی سیاسی مقاصد والے منظر نامے سے ہو،تو جب وہ سیاسی منظر نامہ بدل جائے تو اس تحریک کی معنویت بھی کم ہو جاتی ہے، بلکہ ختم ہو جاتی ہے۔تو اس لیے وہ خوب سمجھتے تھے کہ ترقی پسند تحریک کی اپنی تمام تر قوت، کامیابی اور مقبولیت کے باوجود اس کا زمانہ اب ختم ہو چکا ہے اور نئے لوگ، نئے طرح کے سوچنے والے، نئے

طرح کے کہنے والے، نئے طرح کے توقع رکھنے والے، ادب میں آ گئے ہیں، دنیا میں آ گئے ہیں۔ اوراس لیے انھوں جو''سوغات'' شروع کیا تو یہی خاص مقصد تھاان کا کہ ان نئے حالات کی نمائندگی کی جائے۔ اور''سوغات'' کا جدید نظم نمبر، تو پوچھنا ہی کیا ہے اس کا۔ تو ہم سب لوگوں کے لیے ہمیشہ پہلی تصویر محمود ایاز صاحب کی جدید ادب کو، خاص طور پر جدید شاعری کو فروغ دینے والے ایک باخبر، بے باک اور صاحب نظر صحافی اور مدیر کی ہے۔ اور میں ان کے لیے اس میں کوئی کم تری کا پہلو نہیں سمجھتا جس میں ان کی کوئی ہیٹی ہوتی ہو کہ ان کو مدیر کہا جائے۔ اکثر ادبی تاریخ میں ایسا ہوا ہے کہ مدیروں نے بہت بڑے بڑے کام کیے ہیں۔ انگریزی میں مثال کے طور پر ٹی ایس الیٹ(T. S. Eliot)، ایزرا پاؤنڈ(Ezra Pound) ہیں، اردو میں نیاز فتح پوری کا نام سامنے ہے کہ ہم ان سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ کریں، انھوں نے غیر معمولی کارنامہ انجام دیا۔ محمد طفیل صاحب کا نام سامنے ہے۔ ان کو تو محمد نقوش کہا جاتا ہے۔ ''نقوش'' سے ان کا تعلق اتنا زیادہ اور متحد ہو گیا کہ طفیل اور نقوش ایک ہی ہو کر رہ گئے۔ مدیر کی حیثیت سے یاد رکھا جانا اصل میں اس آدمی کی کامیابی کی بڑی دلیل سمجھا جانا چاہیے، کیوں کہ عام طور پر رسالہ کچھ دن تک چلتا ہے، پھر لوگ اس کو بھول جاتے ہیں۔ رسالے نے جن لوگوں کو پیدا کیا، جن لوگوں کو آگے بڑھایا، ان کی شہرتیں رسالے کی شہرت پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ آپ دیکھ لیجئے کہ یہاں یہ نہیں ہوا۔ ''سوغات'' کے مدیر کی شہرت پر کسی اور کی شہرت کبھی حاوی نہیں ہوئی۔ اس سے بڑھ کر کامیابی کیا ہو سکتی ہے؟

اکرم نقاش : کیا ادب میں ہماہمی اور ہنگامی صورت حال کسی تحریک یا رجحان کی مرہون منت ہوتی ہے؟ اگر نہیں تو پچھلی دو تین دہائیوں میں ادب تو تخلیق ہوتا رہا لیکن ہلچل سے محروم نظر آتا ہے۔ کیا وجہ ہے؟

شمس الرحمٰن فاروقی : اصل میں ادب کے بارے میں، یا کسی بھی انسانی عمل کے بارے میں کوئی عام اصول مرتب کرنا مشکل ہوتا ہے۔ بلکہ مشکل کیا، یہ کہیے کہ غلط بھی ہو سکتا ہے، خاص کر جب ادب کا معاملہ ہو، جو کہ انتہائی ذاتی شے ہے۔ اور ہر شخص کے اپنے اپنے مزاج، اپنے

اپنے منہاج، اپنی فطری صلاحیتوں اور اپنی اپنی فطری توقعات جو خود سے اور ادب سے ہوسکتی ہیں، ان پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کبھی کبھی کسی خاص موقع پر، تاریخ کے یا سماجی پس منظر کے کسی خاص گوشے میں کوئی چیز ایسی آجائے جو لوگوں کو جھنجھوڑ دے اور لوگوں کو نئی طرح سے نئی فکر کی طرف مائل کردے۔ ویسے، ہمارے یہاں ایک بات یہ بھی ہے کہ ہم لوگ، ہندوستان کے سبھی لوگ چاہے اردو کے لکھنے والے بولنے والے ہوں، چاہے اور زبان کے ہوں، کنڑ کے ہوں، تلگو کے ہوں، ہندی کے ہوں، ہم لوگوں کے اور ہمارے ماضی کے بیچ میں ایک بہت بڑی دیوار یا ایک خلیج حائل ہے۔ انگریزی حکومت اور انگریزی حکومت کا قیام اور سنہ 1857 کا حادثہ جس نے ہمارے ماضی کو ہم سے منقطع کردیا۔ اس انقطاع کی بنا پر جو تسلسل اور جو ایک فطری فروغ اور ارتقا تمام زبانوں میں ہونا چاہیے تھا وہ ہمارے یہاں رک گیا۔ اور اس کی جگہ پر ایک، اگر آپ غیر فطری نہ کہیں تو کم سے کم آپ اس کو ایک مصنوعی فروغ یا ارتقا ضرور کہیں گے، مصنوعی ارتقا وجود میں آیا۔ یعنی انگریزی خیالات کو آگے لاکر، انگریزی خیالات کو بڑھاوا دے کر، ادب کو ایک نئے دھارے سے روشناس کیا گیا۔ اس میں کوئی ہرج نہیں ہے، نئی چیزوں کو روشناس کرنے میں کچھ ہرج نہیں۔ لیکن یہاں پر جو المیہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ اس نئے دھارے نے ہمیں اور بھی دور کردیا ان گذشتہ سرچشموں سے جہاں سے ہم نکلے تھے۔ یہاں کنڑ میں یہ بات سب لوگ جانتے ہیں کہ کس طرح سے نوآبادیاتی نظام نے، انگریزی تعلیم نے، اور ادب سے نوآبادیاتی توقعات نے ادب پڑھنے والوں اور ادیبوں کو ایک طرح سے بالکل گم کردہ راہ کردیا۔ ہمارے یہاں تو خیر پھر بھی کچھ چیزیں مشترک تھیں جو کسی حد تک لوگوں کو مجتمع کیے رہیں۔ غزل کی لاکھ برائی کی گئی، حالی نے تو غزل کی کتنی برائی کی، اور دوسرے لوگوں نے بھی، مثلاً امداد امام اثر نے کتنی برائی کی غزل کی۔ لیکن پھر بھی غزل کی قوت ایسی تھی کہ وہ لکھنے والوں کو ایک نقطے پر مرتکز کیے رہی اور غزل کی وجہ سے لوگ غالب اور میر تک پہنچتے رہے۔ جہاں پر یہ صورت نہیں تھی وہاں پر فطری انقطاع پیدا ہوگیا۔ تو اس لیے ایک ہلچل تو ہوئی۔ آج کا میرا جو لکچر ہوگا اس میں یہی باتیں میں کہوں گا کہ سنسنی خیز باتیں ادب کے بارے میں کہی گئیں جو ہمارے یہاں پہلے نہیں کہی جارہی تھیں۔ اور نئے تصورات کے نام پر مغربی اثرات کو کچا پکا ہم لوگوں پر حاوی و

طاری کیا جانے لگا۔مگر اس سے یہ ضرور فائدہ ہوا کہ ہمارے ہاں ایک زبردست تحرک پیدا ہوا ادب کی دنیا میں۔نئی شاعری آئی، ''نیچرل شاعری'' اسے کہنے لگے۔نئی نظمیں آنے لگیں، ترجمے آنے لگے۔افسانہ شروع ہوا، ناول شروع ہو گیا۔ادب میں اخلاقی اور سماجی اقدار کی غیر معمولی اہمیت قائم ہونے لگی۔تو یہ سب چلتا رہا۔ترقی پسند تحریک نے بھی یہی کام کیا۔ترقی پسند تحریک نے ان تمام دھاروں کو، حالی، آزاد اور سرسید اور ان کے ساتھیوں سے جن کا آغاز ہوتا ہے، ان کو ایک جگہ مجتمع کر دیا اور ایک سیاسی معنی اس پر ڈال دیے۔لیکن کام انھوں نے وہی کیا جو حالی، آزاد اور سرسید اور ان کے ساتھی کر رہے تھے۔ یعنی ادب کو ایک مقصد، خاص کر کے ایک سیاسی اور سماجی مقصد اور سماجی تبدیلی کی طرف لوگوں کو مائل کرنے کا آلہ بنا کر کے استعمال کیا جائے۔ پھر ایک نئی ہلچل ہوئی اور شور اٹھا کہ ان لوگوں نے ادب کو روایت سے منقطع قرار دیا ہے۔خود ترقی پسند ادب روایت سے خوف بھی کھاتا تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی ایسی راہ اختیار کی جائے کہ دونوں چیزیں مل سکیں۔تو اس طرح سے جو بھی نئی چیزیں سامنے آئیں ان کے ساتھ ایک ہلچل وابستہ تھی۔ ہم لوگوں نے جب قدم رکھا میدان ادب میں، تو پھر وہی بات پیدا ہوئی لیکن ایک تبدیلی کے ساتھ، کہ پچھلے سو برس یا اس سے کچھ زیادہ میں جن جن باتوں کو مرجح قرار دیا گیا تھا ان کو ہم لوگوں نے حاشیے پر رکھنا چاہا۔مطلب یہ کہ ہم نے کہا کہ ادب کی کوئی سماجی، کوئی اخلاقی اور فلسفیانہ حیثیت ہے تو وہ اس کی ادبی اور فنی حیثیت کے تابع ہے۔اس کے اوپر نہیں ہے۔فنی حیثیت مرجح ہے اور افضل ہے۔ادب کی جو کچھ اور حیثیتیں ہیں وہ مفضول ہیں۔تو ہم لوگوں نے اس طرح جو چیزیں پہلے ہو چکی تھیں اور جن سے کہ انگریزی ادب اور مغربی اثرات کے زیر اثر ہم لوگوں نے بہت کچھ حاصل کیا تھا، انھیں ہم لوگوں نے ایک حد تک حاشیے پر رکھنا چاہا۔جو ہمارے ہاں پرانی اقدار تھیں، کلاسیکی زمانے میں جو اقدار تھیں جن کی رو سے ادب کو انسان کے فنی تصور کا، اس کی فنی شخصیت کا اظہار قرار دیا جاتا تھا، ان کو ہم لوگوں نے آگے بڑھایا۔ کچھ چیزیں ہم لوگوں نے اور ڈالیں جو ان چیزوں کا ایک طرح سے نتیجہ تھیں۔مثلاً جب ہم نے یہ کہا کہ فن ذات کا اور فن کا، اور باطن کا اظہار ہوتا ہے۔اور فن کار کے لیے آزادی ہے کہ وہ اپنے تصورات کو بلا کسی رو رعایت کے، بلا کسی پابندی کے پیش کرے۔تو پھر ظاہر بات ہے کہ ابہام اور مشکل پسندی اور

علامت نگاری اور پیچیدگی یہ تمام باتیں سامنے آئیں۔ تو پھر ایک ہلچل پیدا ہوئی۔ ان ہلچلوں کو تم کبھی بھی اس انقطاع سے الگ نہیں کر کے دیکھ سکتے ہو جو سنہ 1857 ہے اور جو ہمارے ملک کی تاریخ میں سب سے بڑے انقطاع کا نقطہ ہے۔ اچھا ایسی ہلچلیں کیوں نہیں ہوئیں انگریزی میں فرانسیسی میں یا اور زبانوں میں؟ نئی تبدیلیاں وہاں بھی آئیں، مگر وہاں کبھی ایسا نہیں ہوا جو ہمارے یہاں ہوا۔ تو یہ بات تم کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اگر ہم لوگوں نے پچھلے سو، سوا سو برس میں کئی بار تلاطم کا سامنا کیا، یا تلاطم پیدا کیا، یا اس تلاطم سے ہم پیدا ہوئے، تو یہ ادب کی صفت تھوڑی ہے، یہ تاریخ کی صفت ہے۔ تاریخ ہماری ایسی تھی اور خاص کر ہم جو غلام ملک تھے جو آج کی زبان میں جہانِ سوم (تیسری دنیا) کے لوگ تھے، جس طرح سے ہمارا استحصال کیا گیا اس کی مثال مغرب میں کہاں؟ اور پھر یہ کہ ہم مسلمان تھے۔ اس سے انکار نہیں کیا جانا چاہیے۔ بہرحال اگرچہ اردو زبان ہندو مسلمان کی زبان ہے، پہلے بھی تھی، اور اب بھی ہے چاہے لوگ اس سے لاکھ انکار کریں لیکن اس کے مزاج میں مسلمانی عناصر کا عمل دخل بہت زیادہ ہے۔ اور ہندوستانی عناصر یا ہندو عناصر کا عمل دخل بھی ہے۔ اس کے بغیر اس کا مزاج بنتا نہیں ۔لیکن یہ کہنا کہ اردو میں مسلمانوں کا، اسلامی عناصر کا، کوئی ہاتھ نہیں یہ غلط بات ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی غلط ہے جسے پاکستانیوں نے ایک زمانے میں عام کرنا چاہا کہ اردو ادب میں غیر مسلموں کا کوئی عمل دخل نہیں۔ لہٰذا ہمارے ساتھ یہ دو باتیں ہوئیں۔ ایک تو تہذیبی اور سیاسی طور پر ایک بہت بڑی خلیج پیدا ہوئی، گذشتہ سے ہم بالکل الگ ہو گئے۔ مثال کے طور پر، میں نام نہیں لینا چاہتا لیکن مجبوری ہے اس لیے عرض کرتا ہوں، مشہور درسی کتاب ''غزل کا مطالعہ'' (یا ایسا ہی کچھ نام ہے) اختر انصاری صاحب کی، کئی بار چھپی ہے اور اب بھی چھپتی ہے۔ اس پوری کتاب میں غزل کی رسومیات کا کوئی ذکر نہیں۔ غزل کسے کہتے ہیں، غزل کے تقاضے کیا ہیں، غزل کے اشعار کے معنی کو سمجھنے کے لیے کس طرح کی روایت اور کس طرح کے رسومیات کے ڈھانچے سے ہمیں واقف ہونا چاہیے، غزل کے شعر میں معنی کیوں کر پیدا ہوتے ہیں، غزل میں معشوق اور عاشق کی حیثیت کیا ہے، معشوق کو قاتل اور عاشق کو مقتول کیوں کہتے ہیں؟ ان باتوں کا اس کتاب میں کوئی ذکر نہیں۔ پھر ہمیں بعض اور لوگوں..... پھر نام لینا پڑتا ہے، مثلاً ڈاکٹر گیان چند۔ انھوں نے یہ

لکھا ہے کہ صاحب اردو غزل کے اشعار کو انگریزی میں ترجمہ کیجئے تو مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں، معنی سے معرا ہوجاتے ہیں۔ گویا اردو کے اشعار کو جب تک انگریزی میں بامعنی نہ بنایا جائے تب تک وہ اشعار بامعنی نہیں کہلائیں گے۔ حالانکہ پوچھنے کا سوال یہ تھا کہ اگر اردو کے کسی شعر میں کوئی خاص معنی پیدا ہورہے ہیں تو ان معنی کے پیدا ہونے کا پس منظر کیا ہے، ان کا رسومیاتی، ان کا فنی، ان کا ارتقائی پس منظر کیا ہے؟ جب شاعر/متکلم کہتا ہے کہ ؎

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

تو ظاہر بات ہے اس کو انگریزی کیا، صاف اردو میں نثر کیجئے تو معنی سے معرا معلوم ہوگا۔ اس کے لفظی معنی بیان کیجئے یا اس کو نثر میں لکھیئے تو یہ شعر سراسر معنی سے معرا ہے۔ لیکن ایک دنیا ایسی ہے جس میں یہ شعر بامعنی ہے، اور اس دنیا سے متعارف ہوئے بغیر، اس دنیا کو پہچانے بغیر، اس شعر کے ساتھ انصاف تو بڑی بات ہے آپ اس کے نزدیک تک نہیں پہنچ سکتے۔ اور اردو کا ایک بہت بڑا پروفیسر یہ کہتا ہے کہ اس طرح کے شعروں کا ترجمہ اگر انگریزی میں کیا جائے یا ہندی میں کیا جائے تو لوگ ہنستے ہیں۔ کیوں نہ ہنسیں گے، کیونکہ اس کی کنجی ان کے پاس نہیں ہے۔ مطلب کہنے کا یہ ہے کہ اردو کے ساتھ، ہم لوگوں کے ساتھ، جو اردو کے ادیب ہیں، ان کے ساتھ دو بڑے سانحے ہوئے۔ ایک انقطاع ہوا۔ ایک دیوار ہمارے اور ہمارے ماضی کے بیچ آ گئی۔ ہمارے ماضی میں مسلمانوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا اس ماضی کو بنانے میں۔ میں اسلامی نہیں کہتا، مسلمان کہتا ہوں اور اس لیے مسلمان کہتا ہوں کہ ہم مسلمان بھی ایک حد تک ہندو ہیں۔ ہمارے اندر بھی ہندو موجود ہے۔ وہ میر حسن ہوں، میر ہوں، غالب ہوں یا محمد قلی قطب شاہ ہوں، غواصی ہوں، سب کے ہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ہندو موجود ہے۔ مگر وہ مسلمان ہوکر کے موجود ہے۔ وہ مسلمان رنگ میں ڈھل کر موجود ہے۔ دوسرا سانحہ یہ کہ مسلمانوں نے خود کو نئی دنیا میں اور زیادہ استحصال کا شکار دیکھا۔ اور چونکہ اردو کے ادیبوں میں بڑی تعداد ان کی تھی جو مذہبی اور تہذیبی دونوں طور سے مسلمان تھے، لہٰذا انھوں نے اس انقطاع کو عالمی سطح پر محسوس کیا۔ ایک ایک کر کے مسلمان حکومتوں کی آزادی چھنتی چلی گئی۔ پہلے یہ شروع ہوا وسط ایشیا میں جہاں روسیوں نے ہماری ریاستوں کو ہڑپنا شروع کیا۔ کیا بخارا ہو، کیا سمرقند ہو، کیا

ازبکستان، کیا آذر بائیجان تمام ممالک مسلمانوں کے ہاتھ سے چلے گئے ۔مصر کواور ایران کوغلام بنایا گیا معاشی طور پر۔غرض کہ ہر جگہ ہم دیکھتے ہیں...آج عراق کا حال تم جانتے ہولیکن کل کی بات بھی دیکھو کہ کس طرح عراق کا ملک اور نئی حکومت پیدا کی گئی،عثمانی ترکی حکومت کوتوڑ کر۔ یہ بات کوئی بے وجہ نہ تھی کہ 1920 کی دہائی میں ہندوستان کے ہندو مسلمان سب اس بات پر متفق ہوکر انگریز سے نبرد آزما تھے کہ عثمانی خلافت ختم نہ کی جائے ۔توان چیزوں نے بھی بہت حد تک ایک شکست خوردہ اور مدافعانہ ذہن ہم میں پیدا کیا۔ان سب باتوں کی وجہ سے جب بھی کوئی نئی بات پیدا ہوئی تو ایک ہلچل مچی،ایک تلاطم پیدا ہوا،اور ہم تلاطم کو پیدا کرنے والے بھی ٹھہرے اور تلاطم کے پیدا کردہ بھی ٹھہرے۔لیکن یہ کوئی اصول نہیں ہے ادب کا ،اور میں سمجھتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آئندہ پچاس سوسال میں اردو ادب کے پڑھنے والے اور لکھنے والے باقی رہتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ باقی رہیں گے،تو شاید یہ صورت حال بدلے اور نوآبادیاتی انہدام کے نتیجے میں جو ہماری تہذیب کا استحصال ہوا اس کی ہم ایک حد تک تلافی مافات کر سکتے ہیں۔

اکرم نقاش : جدیدیت کے زیر اثر تخلیقی آزادی اور تجربہ پسندی کو جس قدر رواج وفروغ ہوا اس کی مثال اردو ادب میں ملنا مشکل ہے۔اس سلسلے میں ’’شب خون‘‘ کی خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ یہ سب شعوری عمل تھا کہ ادب میں امکانات کی تلاش؟

شمس الرحمٰن فاروقی : دونوں ایک ہی بات ہیں،شعوری عمل کہو، یا امکانات کی تلاش۔جیسا ابھی میں نے کہا، ہمارے ادب کی تاریخ میں پچھلے سو،سوا سو برس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے ہم پچھلے انقطاع اور استحصال سے الگ کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ اور یہ بھی ایک طرح سے استحصال تھا جب ہم سے یہ کہا گیا کہ آپ عنوان دے کر نظم کہیے،فلاں موضوع پر نظم لکھیے، برکھارت پر نظم لکھیے ،اور کہا گیا کہ آپ کی پوری شاعری بالکل از کار رفتہ ہے اور اس کا کوئی مقصد کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔اسے آپ بھول جائیے بالکل۔ بلکہ یہاں تک کہہ دیا گیا کہ یہ کچھ ہے ہی نہیں،وجود ہی نہیں رکھتی۔تو اس پس منظر میں جب تم دیکھو تو لازم ہے کہ کبھی ایسا کوئی ذہن پیدا ہو جو ادب کی اور خاص کر ہمارے ادب کی ادبیت کو اور اس کی

روایات کو،اوراس کے اصولی اورنظریاتی پس منظرکوآ گے لائے ،تو اس کوشعوری عمل کہیں تو بھی درست ،یا اسے پچھلے سو،سوا سو برس کی تاریخ کے دباؤ سے آزاد ہونے کی باغیانہ کوشش کہیں تو وہ بھی درست ،یا یہ کہیں کہ اتنا دباؤ بڑھ چکا تھا کہ اس کی ایک انتہا آ چکی تھی اوراس کا زوال ہونا تو لازمی تھا تو وہ بھی ٹھیک ۔تم جانتے ہو کہ ترقی پسند زمانے میں یہاں تک کہا جانے لگا تھا کہ جو اچھا کمیونسٹ نہیں وہ اچھا ادیب نہیں ہے ۔ کتنے ہی لوگوں کو تحریک سے باہر نکالا گیا اور یہ کہا گیا کہ آپ تحریک کے مقاصد کو پورا نہیں کرتے ہیں ۔ جو تقاضا ادب کے بارے میں ہم آپ سے کررہے ہیں وہ تقاضا آپ پورا نہیں کررہے ہیں ۔تو اس زمانے کے جو بہترین لوگ تھے، یا تو وہ تحریک میں شامل نہیں ہو سکے یا تحریک سے نکالے گئے ۔ جیسے کہ منٹو صاحب ہوئے ، بیدی صاحب ہوئے ،عسکری صاحب ہوئے ،قرۃ العین حیدر ہوئیں ۔تو یہ کیوں ہوا؟ یہ اس لیے ہوا کہ نو آبادیاتی اثرات کا دباؤ اتنا بڑھ گیا تھا...تو ایک انتہا تک پہنچنے کے بعد دباؤ کی بھی ایک حد آ جاتی ہے پھر زوال شروع ہوتا ہے ۔تو جدیدیت یا ''شب خون'' یا شمس الرحمٰن فاروقی یا ان کے ساتھی ،ان لوگوں نے جو بھی کیا اس میں یہ سب چیزیں موجود تھیں ۔ بنیادی طور پر ایک تاریخ ہمارے پیچھے تھی اوراس تاریخ کے استحصالی تجربے نے ہمیں مجبور کیا تھا کہ ہم اس دباؤ سے باہر نکلیں ۔ چنانچہ یہ صورت حال پیدا ہوئی ،اور ظاہر ہے کہ نئی صورت حال جب پیدا ہوتی ہے کہیں پر بھی تو اس کے نتیجے میں افراط بھی ہوتی ہے ،اور تفریط بھی ہوتی ہے ۔اوراس افراط وتفریط کو میں برا بھی نہیں سمجھتا کیوں کہ کسی بھی چیز کو، خاص کر کسی قائم شدہ چیز کو، مسترد کرنے میں یا اس کی بیخ کنی کرنے میں یا اس کی قدر کو صحیح طرح سے بیان کرنے میں ،ہوسکتا ہے کہ نئی چیزوں کے بارے میں کچھ مبالغے سے کام لیا جائے ۔کسی چیز کو بڑھا کر بتایا گیا یا زور دے کر بتایا گیا ۔اب وہ مبالغہ باقی نہیں ہے ۔ وہ ہلچل نہیں ہے جو اس زمانے میں تھی ۔نئی چیزوں کی ہلچل پہلی جیسی نہیں رہ گئی ہے کیونکہ نئی چیزوں میں خود بھی ایک طرح کا اعتبار ،ایک طرح کا استحکام آ گیا ہے ۔

اکرم نقاش : آپ کی شخصیت جدیدیت کے بانی ومبلغ کی رہی ہے ۔لیکن جب آپ کی تحریروں پر نظر ڈالتے ہیں تو آپ بالکل مختلف رنگ میں نظر آتے ہیں اس کی کیا وجوہات ہیں؟

شمس الرحمٰن فاروقی : آپ کے بیان میں خود تضاد ہے۔ میں جدیدیت کا بانی ومبلغ ہوں تو میری تحریروں میں اسے نظر آنا چاہیے۔ اصل میں تم جو کہنا چاہتے ہو وہ یہ ہے...جس کو کہ میرے دوستوں نے اور میرے مخالفوں نے ،انھیں جو بھی نام دیا جائے، کئی طرح سے محسوس کیا ہے۔ مثلاً یہ کہا گیا کہ فاروقی صاحب ماضی کے کھنڈر میں پناہ لے رہے ہیں۔ کہا گیا کہ شمس الرحمٰن صاحب تو Neo Conservative ہو رہے ہیں حالاں کہ یہ بات جو لوگ کہہ رہے ہیں وہ یہ جانتے بھی نہیں کہ Neo Conservative کیا بلا ہوتی ہے، لیکن کہا انھوں نے، کیوں کہ انھیں تو محض نام دھرنے سے غرض تھی، میرے کام اور پیغام کو سمجھنے سے انھیں کوئی غرض نہ تھی۔ اصل میں اگر تم ایک منٹ بھی غور کر کے دیکھو تو کل سے لے کر اب تک جو بھی میرے یہاں ہے اس میں بالکل ایک فطری ارتقا ہے۔ یعنی یہ نہیں ہے کہ کسی اندھے کے ہاتھ میں لالٹین ہے، کبھی یہاں پڑ رہی ہے کبھی وہاں پڑ رہی ہے۔ اس میں ایک فطری ارتقا ہے۔ شروع شروع میں، میں نے جب لکھنا شروع کیا، تو لوگوں نے کہا کہ صاحب لیجئے آپ تو وہ سب باتیں کہہ رہے ہیں مضمون کی، تشبیہ کی، استعارے کی، جو نیاز صاحب کہا کرتے تھے، شبلی صاحب کہا کرتے تھے۔ نئی بات کون سی کہہ رہے ہیں آپ؟ میں نے کہا۔ اور کہاں سے کہوں، یہ تو بنیادی باتیں ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان لوگوں کا نقطۂ نظر محدود تھا، ہمارا تناظر وسیع تر ہے۔ تو میں نے یہ کہا، پہلی بار میں نے ہی کہا اور اس پر اب تک قائم ہوں، کہ نئی شاعری اور پرانی شاعری میں کوئی فرق نہیں ہے، دونوں شاعری ہیں۔ اس سے مراد یہ تھی کہ ایک اصل ہے، ایک بنیاد ہے جس پر ایک پورا محل قائم ہے۔ تو فطری طور پر اس کا ایک تقاضا یہ بھی تھا کہ میں پہلے تو لوگوں کو پرانی، جو اس وقت کی شاعری تھی جس کو وہ ترقی پسند شاعری کہتے تھے، اس کی کم زوریوں سے لوگوں کو مطلع کر دوں۔ چناں چہ آپ کو یاد ہی ہوگا...نہیں یاد تو نہیں ہوگا کہ آپ تو بہت چھوٹے رہے ہوں گے اس وقت، لیکن اور لوگوں کو یاد ہوگا کہ میں نے ایک تبصرہ لکھا سردار جعفری پر۔ تو صاحب اس تبصرے سے معلوم ہوا کہ ایک چیز جو کہ قائم ہے اور جس کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ قائم ہو چکی ہے، اس میں بھی ناپائیداری کے عناصر ہیں۔ اس میں بھی عناصر ایسے ہیں جو اتنے مستحکم نہیں ہیں جتنا کہ بیان کئے گئے ہیں۔ تو پہلے تو میں نے وہ کام

کئے۔ پھر میں نے اصولی طور پر جدید شاعری کے تقاضے کیا ہیں، یہ شاعری کیا چاہتی ہے ہم سے، یا ہم اس شاعری سے کیا چاہتے ہیں، وہ مسائل بیان کئے۔ پھر وہی معاملہ افسانے کے ساتھ بھی رہا۔ پھر میں نے اس طرح کی چیزوں کو چھاپا، اس طرح کی چیزوں کا ذکر کیا جنھیں میں ادب کے صحیح نمونے سمجھتا تھا، یعنی ایسے نمونے جن میں تخلیقی شان ہو، تجربہ کوشی ہو، کسی سیاسی یا سماجی غرض کو فن پر فوقیت نہ دی گئی ہو۔ میں نے ان کی تفہیم کی، سمجھایا، لوگوں تک پہنچایا، تو اس طرح آہستہ آہستہ وہ بات بڑھتی چلی گئی۔ اچھا، جب یہ ہو چکا تو اس کے بعد یہ ہوا کہ ایک بار پھر ذرا رک کے دیکھیں کہ ہماری بنیادیں کیا کیا ہیں؟ ان بنیادوں میں صرف غالب تو نہیں ہیں؟ غالب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن غالب سب کچھ تو نہیں ہیں، ہماری بنیادوں میں اور کیا ہوسکتا ہے؟ اس طرح آگے چلے۔ تو جو کچھ بھی میرا کام ہے، داستانوں تک میرا پہنچنا، لغت پر، الفاظ پر غور کرنا میر کے بارے میں غور کرنا، مرثیے کی شعریات اور زبانی بیانیے کی شعریات کو بیان کرنا، پھر یہاں تک کہ تنقید سے ہٹ کر افسانہ اور ناول میں بھی اس طرح کی تہذیب کو دوبارہ لانے کی کوشش کرنا جو ہم سے کھو چکی ہے لیکن جس کے سمجھے بغیر ہم اپنے کو نہیں سمجھ سکتے، اپنے ادب کو نہیں سمجھ سکتے...تو ان سب میں ایک فطری عمل ہے یہاں سے وہاں تک۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی ایک بٹن دبائے چلے جارہے ہیں، ایک کھٹکا دبایا گیا ایک راستہ بند ہوا، ایک راستہ کھلا۔ بلکہ یہ تو ہونا ہی تھا شمس الرحمٰن فاروقی جیسے آدمی کے لیے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ میں صرف نثری نظم اور معرا نظم کی بحث میں ہی الجھا رہ جاتا۔ ان بحثوں کو میں نے اپنے طور پر طے کرلیا کہ یہ ایسا ہے ایسا نہیں ہے۔ اب چاہے وہ میں نے غلط طے کیا یا صحیح طے کیا۔ یا میں نے طے شاید نہیں بھی کیا لیکن میں نے گمان کیا کہ میں نے طے کرلیا ہے۔ اپنی طرف سے جو کچھ کہنا تھا میں نے کہہ دیا ہے۔ اب سوال یہ اٹھا کہ یہ چیزیں کن چیزوں پر قائم ہیں؟ اب دیکھیے کہ ہم کسی نظم کو معرا کیوں کہتے ہیں یا کسی نظم کو آزاد کیوں کہتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کے پیچھے کوئی اصول ہوگا کہ کوئی نظم ایسی بھی ہوگی جو غیر آزاد ہوگی، جو کچھ پابند ہوگی، تو وہ کیسی ہوتی ہوگی، کس طرح سے بنتی ہوگی؟ اگر جدید نظم کوئی چیز ہے تو محمد قلی قطب شاہ سے لے کر نظیر اکبر آبادی تک، اور پھر نظیر اکبر آبادی سے حالی اور آزاد تک جو نظم لکھی گئی اسے ہم کس طرح سمجھا سکتے ہیں کہ اس کلام کی نظمیت بھی قائم رہے اور اقبال، میراجی، راشد، فیض، اختر الایمان، مجید

امجد کی بھی نظمیت کو بیان کیا جا سکے؟اس طرح کے سوال اٹھنے اور اٹھانے لازمی تھے۔اس طرح سے ہر چیز ایک کے بعد ایک چلی آتی ہے۔ان کے بیچ میں کوئی تفرقہ نہیں ہے اور کوئی وقفہ نہیں ہے،ایک ارتقا ہے۔

اکرم نقاش : سنہ 1960 کے بعد شاعری افسانہ اور تنقید میں بے شمار نئے نام ادبی منظر نامے پر ابھرے اور بہت کم عرصے میں انھوں نے اپنی شناخت بھی بنائی۔پچھلے بیس تیس سالوں میں ان اصناف میں کیا ایسے کچھ نام ہیں جو فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں جنھوں نے اپنے وجود کا احساس دلایا اور اپنی مستحکم پہچان بنائی؟

شمس الرحمٰن فاروقی : یار یہ فیشن جو تم لوگوں نے شروع کیا ہے نام گنوانے کا،اسے بھول جاؤ۔دس نام گنواؤں گا،دو نام بھول جاؤں گا تو کہیں گے کہ صاحب یہ نام چھوڑ دیا،یا یہ کہ فلاں کو کیوں رکھا؟ بھئی نام وام میں نہیں گنوانا چاہتا۔میں یہ کہنا چاہتا ہوں...صرف ایک بات بتادوں کہ جیسی بھی آج شاعری ہورہی ہے یا افسانہ لکھا جارہا ہے...اچھا ہے یا خراب،میں نہیں کہتا۔لیکن یہ ضرور کہتا ہوں کہ کیا اس طرح کے افسانے 1960 کے پہلے ممکن تھے؟ کیا ایسی شاعری 1960 کے پہلے ممکن تھی؟ ناممکن۔آزادی اظہار اور آزادی فکر کی جو فضا آج ہے وہ جدیدیت کے پہلے کہاں تھی؟ وہ پورا نظام بدل گیا شعریات اور اصولوں کا جو پہلے قائم تھا۔اب اس میں زوال پیدا ہوا یا نہیں پیدا ہوا یا اس کے بعد کے لوگوں نے اسے ترک کیا یا نہیں کیا،یہ الگ بحثیں ہیں۔لیکن متعدد نام ایسے موجود ہیں ہمارے سامنے،افسانے کی دنیا میں یا شعر کی دنیا میں،جنھوں نے اس ترقی پسند یا نام نہاد کلاسیکی بوطیقا سے منحرف ہوکر اس سے برگشتہ ہوکر کہا کہ دیکھیے شعر یوں بھی کہتے ہیں۔نام ہی چاہتے ہیں اگر آپ تو آپ کے سامنے محمود ایاز کی مثال موجود ہے محمود ایاز کا رنگ کلاسیکی رنگ ہے۔لیکن پھر بھی کسی بھی جگہ،1960 کے پہلے کسی جگہ اس کو آپ قائم نہیں کر سکتے۔کیوں وہاں کوئی جگہ ہی نہیں ہے اس کے واسطے۔اس کی جگہ اگر ہے تو ہمارے درمیان ہے،اور آج بھی ہے۔سنہ 1960 کو گذرے پچاس برس ہونے والے ہیں۔محمود ایاز کی جگہ آج بھی قائم ہے،لیکن ہم لوگوں میں،ترقی پسندوں میں نہیں۔تو یقیناً اس پورے فکری انقلاب نے جو کچھ قائم کیا یا جس چیز کو ادب میں متعارف کیا اس کی ایک معنویت اب بھی موجود ہے۔اور یہی ہمارے

لیے کافی ہے...نام لینے کو میں لے سکتا ہوں لیکن نام لینے سے میں گریز کرتا ہوں کیوں کہ ہمیشہ لوگوں کو توقع ہوتی ہے کہ میرا نام ضرور لیا جائے گا یا فلاں کا نام نہیں لیا جائے گا۔ میں دونوں باتوں سے گریز کرتا ہوں۔

اکرم نقاش : دو چار نام لیجیے گا لوگ خوش ہو جائیں گے۔

شمس الرحمٰن فاروقی : خوش کرنے کا کام میں نہیں کرتا۔ میں خوش کرنے کے بزنس میں ہوں ہی نہیں۔اورلوگ ہیں، وہ نام گنوا دیں گے۔

اکرم نقاش : جدیدیت نے ادب کو شاعری اور فکشن کے رنگوں سے مالا مال کیا۔ ان میں سے کس صنف میں زیادہ کامیاب تجربے ہوئے اور تا حال جدید شاعری اور فکشن کے بڑے نام کون سے ہیں؟

شمس الرحمٰن فاروقی : پھر وہی نام کا چکر ہے۔ تجربے دونوں صنفوں میں ہوئے۔شاعری میں بھی ہوئے اور افسانے میں بھی ہوئے۔افسانے کے تجربات نے لوگوں کو زیادہ پریشان کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ افسانہ اس وقت تک بالکل ایک سیدھی لکیر میں چلتا چلا جا رہا تھا۔ منٹو صاحب کے کچھ افسانوں کے علاوہ ، بیدی صاحب کے ایک دو افسانوں کے علاوہ ، انحراف کی مثال مشکل ہی سے ملتی تھی۔ایک افسانہ پریم چند کا،ایک افسانہ کرشن چندر کا، پانچ سات افسانے عسکری صاحب کے اس فہرست میں اور شامل کر لیجیے۔ پریم چند کا افسانہ ''کفن'' تو لوگوں کو یاد تھا،لیکن غلط وجوہ سے۔عسکری صاحب کے افسانوں کو زیادہ تر لوگ بھول چکے تھے اور منٹو صاحب ، بیدی صاحب، کے جو افسانے ڈگر سے ہٹے ہوئے تھے (مثلاً منٹو کا ''پھندنے''، بیدی صاحب کا ''سونفیا'') ان کا ذکر کرتے لوگ گھبراتے تھے۔تو ان کے علاوہ افسانے کی ایک منہاج جو چل پڑی تھی اس کے حساب سے سیدھا سادہ افسانہ لکھا جا رہا تھا جس میں کچھ کردار ہوں گے، کچھ واقعات ہوں گے۔اور خاص طور پر بلا کسی پیچیدگی کے ایک پیغام ایک مقصد یا معنی اس میں ڈال دیئے جائیں گے۔کرشن چندر صاحب کا افسانہ ''دو فرلانگ لمبی سڑک'' سامنے کی مثال ہے کہ اس کو بہت بڑا انقلاب

قراردیا گیا تھا کہ اس میں کوئی پلاٹ نہیں تھا۔حالاں کہ وہ آج کے... یا آج اس کو پڑھیے تو بالکل وہ انتہائی سیدھا، انتہائی سپاٹ افسانہ معلوم ہوتا ہے لیکن چوں کہ اس میں کوئی پلاٹ نہیں تھا، بلکہ ایک شخص لب سڑک بیٹھا ہوا آنے جانے والوں کا ذکر کررہا ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے، مشاہدہ کررہا ہے، بیان کررہا ہے۔تو اسے ایک انقلاب قراردیا گیا۔اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ افسانے میں اس وقت جو ہوا بہہ رہی تھی وہ کتنی آسان اور سادہ تھی۔اس لیے نئے افسانے نے لوگوں کو زیادہ مبتلائے رنج کیا، پریشان کیا۔کہیں تو کوئی پلاٹ نہیں ہے، کہیں کردار نہیں ہے۔ کہیں لکیریں کھنچی ہوئی ہیں، کہیں نثر کے نام پر نثری نظم نظر آرہی ہے۔ کہیں پر اتنی علامتیں ہیں کہ پلے نہیں پڑ رہا ہے کہ کیا کہا جارہا ہے۔تو آہستہ آہستہ ظاہر ہے وہ بھی ختم ہوا۔ کچھ تو افسانہ نگاروں کے ہاں بھی شدت ختم ہوئی کہ ان کا پہلا مقصد جو تھا، لوگوں کو نئے امکانات کی طرف متوجہ کرنا، وہ پورا ہوا۔ کچھ یہ بھی ہے کہ لوگوں کو عادت پڑگئی۔جس طرح سے پہلے... آپ کو تو خیال ہی ہوگا کہ ترقی پسند حضرات نے آزاد نظم کہنے سے بہت حد تک گریز کیا۔ان کا خیال تھا کہ ہم یہ سب کہیں گے تو بدنام ہوجائیں گے۔یا یہ شاعری کا طریقہ ہی نہیں ہے کہ آزاد نظم کہی جائے۔پھر آہستہ آہستہ ان لوگوں نے، مخدوم صاحب نے، پہلے آزاد نظم کہنی شروع کی اور پھر سب ترقی پسندوں میں عام ہوگئی۔غزل کا بھی یہی معاملہ تھا...تو اس طرح سے جب کوئی چیز مسلسل ہونے لگتی ہے تو پھر اس کی لوگوں کو عادت پڑجاتی ہے۔ لوگ اس سے ایک طرح سے مانوس ہوجاتے ہیں۔ مانوس ہوتے ہیں تو اس سے لگاؤ پیدا ہوجاتا ہے۔تو وہی یہاں بھی ہوا۔ افسانے کچھ تھوڑے بہت آسان بھی ہوئے اور لوگ کچھ مانوس بھی ہوئے اس کے ساتھ۔تو آہستہ آہستہ وہ جو ایک عنصر تھا سنسنی خیزی کا، وہ نئے افسانوں میں کم نظر آنے لگا۔ ورنہ تجربہ تو دونوں اصناف میں ہوا، شعر میں بھی ہوا اور افسانے میں بھی ہوا۔اور دونوں میں نئی باتیں کہی گئیں، اور نئے اشارے دیے گئے اور نئی راہیں دریافت کی گئیں۔ آج کوئی افسانہ نگار ایسا نہیں ہے جس نے ان راہوں سے کہیں نہ کہیں اپنے کو منسلک نہ کیا ہو۔وہ لوگ جو جدیدیت کے خلاف ہیں ان کے افسانے دیکھیے۔اچھے یا برے، جیسے بھی وہ افسانے ہیں، اس طرح کے افسانے جدیدیت کے پہلے ممکن نہ تھے۔ابھی کچھ دن پہلے ''آج کل'' دہلی کا افسانہ نمبر آیا ہے۔اس میں کئی افسانہ نگار ایسے ہیں (جو کسی نہ کسی وجہ کی

بنا پر) خود کو جدیدیت کا مخالف بتاتے ہیں۔ مذکورہ نمبر میں ان کے افسانے جیسے بھی ہیں، اچھے یا برے، لیکن جدیدیت کے پہلے وہ وجود میں نہ آسکتے تھے۔ یہ کہنا اگرچہ کافی نہیں ہے کہ زمانہ بدل گیا ہے اس لئے افسانہ بھی بدل گیا ہے لیکن یہ بات بھی ہماری ہی سکھائی ہوئی ہے اور ترقی پسند لوگ اس پر بہت ناک بھوں چڑھاتے تھے، کیوں کہ ان کے خیال میں ادب کی مارکسی اقدار قائم و دائم تھیں اور زمانے کے بدلنے کا ان پر کوئی اثر نہ پڑنا تھا۔ ان بچاروں کو یہ معلوم کر کے بڑا دھکا لگا کہ جب زمانہ بدلتا ہے تو ادب کے اقدار بھی بدل سکتے ہیں۔ لیکن زمانے کے بدل جانے کے علاوہ دوسری بات یہ بھی ہے کہ ان افسانوں کا مثالی نمونہ (Paradigm) جدیدیت ہی میں ہے۔

اکرم نقاش : ایسا کہا جاتا ہے کہ یہ دور تنقید کا ہے۔ آج تخلیق کار تنقید کی رہنمائی میں ادب خلق کر رہا ہے۔ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے؟

شمس الرحمٰن فاروقی : اگر ایسا ہے تو بڑے افسوس کی بات ہے۔ میں تو اس کو نہیں مانتا۔ یہ ضرور ہے کہ جیسا کہ میں نے لکھا بھی ہے کہ... میرا حالیہ مضمون تم نے شاید دیکھا ہوگا: ''کیا نقاد کا وجود ضروری ہے؟''... کچھ صورت حال ایسی پیدا ہوگئی کہ ہمارے ہاں نقاد، یا مبصر، یا ادب کا مفسر کہہ لیجئے، وہ بہ طور ایک وجود کے ہمارے سامنے قائم ہے۔ پہلے زمانے میں یہ تھا کہ استاد تھے اور... بلکہ اور پہلے چلے جاؤ تو استاد بھی نہیں تھا۔ ولی کے پہلے کوئی استاد نہیں تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کا کوئی استاد نہیں، غواصی کا کوئی استاد نہیں، نصرتی کا کوئی استاد نہیں۔ تو پہلے تو استاد تھے نہیں تو شاعر خود ہی اپنی تربیت کرتا تھا۔ جیسا کہ تم نے دیکھا ہے کہ شعرا نے لکھا ہے۔ ولی نے لکھا ہے اپنے بارے میں، اشرف گجراتی نے لکھا ہے اپنے بارے میں کہ میں نے کیا کیا پڑھا۔ میں نے منطق پڑھی، فلسفہ پڑھا، تفسیر پڑھی، فارسی پڑھی، عربی پڑھی۔ یہ سب انھوں نے لکھا۔ ملا نصرتی نے لکھا کہ میں نے کن کن چیزوں کا مطالعہ کیا ہے۔ تلگو، کنڑ، پھر فارسی کی طرف اپنے کو مائل کیا اور ہندی کے شعر کو جوں شعر فارسی کیا۔ پہلے زمانے میں تو شاعر کسی کا شاگرد نہیں ہوتا تھا۔ استاد کا وجود بھی تھا نہیں۔ اس کی دو وجہیں تھیں: ایک وجہ تو یہ تھی کہ جس روایت میں وہ سانس لے رہے تھے وہ روایت ان کے لیے زندہ موجود تھی۔

نصرتی جب یہ کہتے ہیں کہ میں نے ریختہ کا شعر فارسی کیا، تو ان کے سامنے فارسی زندہ موجود تھی۔ آج ہمارے لئے فارسی ایک کتابی شے ہے، اور وہ بھی سب کے لئے نہیں۔ زمانہ بدل چکا ہے۔ اس تبدیلی کے دوران ہم نے بہت کچھ پایا اور بہت کچھ گنوایا۔ تو یہ بھی گنوایا کہ جو چیزیں ہمارے کلاسیکی شاعر کے لئے زندہ اور متحرک تھیں، ان کی زندگی کا حصہ تھیں، ان میں اکثر ہمارے لئے معدوم ہیں اور جو موجود بھی ہیں تو زیادہ تر کتابی اور علمی ہیں۔ عمل کی زندگی میں نہیں ہیں۔ اس وقت فارسی شاعری فارسی ادب فارسی ادبیات زندگی کا ضروری حصہ تھے۔ لہٰذا شاعر کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ اس ماحول میں اپنے کو بالکل غرق کر لے اور خود اپنے کو شاعر کے طور پر قائم کرے۔ دوسری بات یہ تھی کہ شاعری کی اس زمانے میں بہ طور ایک مشغلۂ حیات بڑی اہمیت تھی۔ آہستہ آہستہ وہ کم ہوتی چلی گئی اور ہمارے زمانے میں بہت ہی کم ہوگئی۔ کئی وجہیں ہیں اس کی، ان میں نہیں جاؤں گا۔ لیکن یہ بات سامنے کی ہے کہ آج آپ کو ایسے لوگ شاید ہی ملیں، مشاعرے کے اکادکا شاعر ہوں تو ہوں، جو صرف شاعری کے بل بوتے پر یا مشاعروں ہی کے بل بوتے پر زندہ ہیں اور کما کھا رہے ہیں اور اولاد کی پرورش کر رہے ہیں۔ ورنہ عموماً اب کوئی ایسا آدمی نہیں ہے جو صرف شاعری کے بل بوتے پر زندہ رہتا ہو۔ تو شاعری ایک مشغلۂ حیات کے طور پر اب زندہ نہیں رہی۔ اس زمانے میں تھی موجود۔ لہٰذا اس میں کوئی بری بات نہیں تھی کہ ہم شاعر بن جائیں اور شاعری پڑھیں شاعری پڑھائیں، شاعری لکھیں شاعری لکھائیں۔ لوگ خود ہی کوشش کرتے تھے۔ تو اس کام کے لیے اس زمانے میں استاد نہیں تھا۔ پھر، جیسا کہ میں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے، دلی والوں نے اردو کو اختیار کیا تو بہت بعد میں اختیار کیا۔ زبان تھی، لیکن شاعری عموماً فارسی میں تھی۔ تمھارے یہاں تو اردو شاعری بہت پہلے چل چکی تھی۔ سارے دکن میں ہر جگہ موجود تھی، جو آج کا مہاراشٹر ہے وہاں موجود تھی، گجرات میں تو خیر تھی ہی۔ جب دلی والوں نے ولی کی دیکھا دیکھی اردو شاعری کو اختیار کیا تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہ ہم اس کو لکھیں کیسے؟ پھر انھوں نے استاد لوگوں کو ڈھونڈنا شروع کیا کہ کچھ بتاؤ ہمیں کہ ریختہ کیسے لکھا جاتا ہے؟ اگر طرز کی مثال کے طور پر دکن کو دیکھتے تو کامیابی مشکل تھی۔ دکن کا طرز مشکل تھا اور یہاں کی زبان سے مختلف محاورہ تھا اس کا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہی ہیں کہ شفیق اورنگ آبادی صاحب نے لکھا ہے

کہ نصرتی کا طرز دلی والوں کے لیے مشکل تھا۔ان کے الفاظ بہت ہی مغلق ہیں۔ان کی زبان میں تلگو کا عنصر بہت ہے، کنڑ بہت ہے۔دلی والوں نے کہا ہمیں تو ایسا آدمی چاہیے جو کہ ہمیں سمجھائے کہ زبان ریختہ میں بطرز فارسی کیونکر کہتے ہیں، جیسا کہ ولی نے کہا۔اس طرح استاد شاگرد کا ایک رشتہ قائم ہو گیا۔اب یہ ہوا کہ استاد آپ کے سامنے موجود ہے، آپ نے شعر پڑھا۔اس نے کہہ دیا، یہ ٹھیک نہیں ہے یوں ٹھیک کر لیجیے اس کو آپ۔یا بالکل ٹھیک نہیں تو پھر سے کہہ کر لائیے۔کسی رسمی یا رسومیاتی تعلیم کے بغیر سلسلہ تعلیم و تعلم کا، ایک رشتہ شاعری کے بارے میں، قائم ہو گیا۔اور یہ سلسلہ کامیاب ہوا اور ہر طرف چل پڑا۔سو برس چلا، ڈیڑھ سو برس چلا۔پھر وہی بات ہوئی جس کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں کہ انقطاع پیدا ہو گیا۔اس انقطاع میں ایک چیز اور شامل ہو گئی۔اسکول داخل ہو گیا۔اب معلوم پڑ گیا کہ اردو فارسی شاعری اسکول میں پڑھائی جا رہی ہے۔اردو میں امتحان تو لیا جا رہا ہے۔کبھی غالب کے شعر کا مطلب پوچھ رہے ہیں کبھی میر کی غزل اور سودا کا قصیدہ پوچھا جا رہا ہے کہ بتاؤ یہ کیا ہیں؟ وہ جو ایک براہ راست سلسلہ تھا استاد شاگرد کا، اس کی جگہ کلاس اور درجہ قائم ہوا، جماعت قائم ہوئی۔ماسٹروں کے گروہ میں لازماً شاعر لوگ نہیں ہیں۔وہ تو ایک ماسٹر ہے جو ضروری نہیں کہ وہ شاعر بھی ہو اور وہ آپ کو تعلیم دے رہا ہے کہ میر نے یہ کہا، غالب نے یہ کہا ہے، نصرتی نے یہ کہا ہے، باقر آگاہ نے یہ کہا۔پھر شاگرد نے جو سیکھا اس کا امتحان پرچۂ امتحان کے ذریعہ لیا گیا۔آپ پرچہ لکھ کر آئے اور نتیجے کے منتظر ہو گئے۔جب نتیجہ آیا تو یہ تو معلوم ہو گیا کہ ہم پاس ہوئے یا فیل، لیکن یہ نہ معلوم ہوا کہ اچھے نمبر کن باتوں کے لئے ملے اور کم نمبر کن باتوں کی وجہ سے ملے؟ اور یہ تو بالکل نہ معلوم ہوا کہ میر یا غالب یا ولی کی طرح شاعر بننے کے گر کیا ہیں؟ تو جب وہ استاد شاگرد کا سلسلہ رہا ہی نہیں، وہ ذاتی تعلیم اور تعلم کی بات نہ رہی، بلکہ شاعری کا پڑھنا پڑھانا ایک غیر شخصی عمل ہو گیا اور ایک نئی طرح کا استاد پیدا ہوا جس کا نام ماسٹر رکھا گیا، پروفیسر رکھا گیا۔ اس کے نتیجے میں وہ جو براہ راست، سینہ بہ سینہ، دو بدو گفتگو ہوتی تھی شعر کو سمجھانے اور سمجھنے کے لیے، وہ ختم ہو چکی ہے۔اب کلاس پیدا ہوئے، اسکول پیدا ہوا، یونیورسٹی پیدا ہوئی جس میں پڑھانے کے لیے صاحب کتاب ہونا چاہیے۔تو کون لکھے گا کتاب؟ کتاب ہم لوگ لکھیں گے اور اسے یونیورسٹی میں پڑھائیں گے۔جن لوگوں نے

کتاب لکھی وہ نقاد کہلائے۔اس طرح سے پرانے استادوں کی براہ راست تعلیم کے بہ جائے تنقید کا ایک پورا کاروبار پیدا ہوا۔آپ کی سماجی تاریخی تہذیبی مجبوریوں کی بنا پر ایک پورے ادارے کا وجود قائم ہو گیا جس نے ایک بڑی حد تک پرانے زمانے کے استاد کی جگہ لے لی۔ پہلے یہ تھا کہ استاد کہہ رہا ہے کہ یہ مصرع ٹھیک نہیں ہے تو شاگرد کو ماننا پڑتا تھا کہ ٹھیک نہیں ہے۔اب استاد نہیں ہے تو عسکری صاحب کہہ رہے ہیں کہ یہ نظم، یہ ناول، یہ افسانہ، ٹھیک نہیں ہے۔تو لوگ کہہ رہے ہیں کہ ٹھیک ہے ہم آپ کے شاگرد ہیں، آپ کی بات پر آمنا وصدقنا کہتے ہیں۔سرور صاحب کہہ رہے ہیں، فلاں طرح کی شاعری نہیں ٹھیک ہے تو شاگرد بھی یہی کہہ رہا ہے کہ ٹھیک نہیں ہے۔تو یقیناً اس طرح سے نقاد کو ایک غیر ضروری اہمیت حاصل ہوئی۔ ہمارے ادبی معاشرے میں ایک غیر ضروری اہمیت نقاد کو حاصل ہوئی جو اسے نہیں ملنا چاہیے تھی، لیکن ملی۔اب جب وہ مل گئی تو ظاہر ہے کہ اس سے مفر نہیں۔ میں نے لکھا بھی ہے کہ انسانوں کی بہت بڑی مشکل یہ ہے، بلکہ ہمارا المیہ یہ ہے کہ بہت سی چیزیں ہم خود بناتے ہیں، وہ ہماری تخلیق ہیں۔لیکن ان کو پھر ہم منسوخ نہیں کر سکتے۔مثلاً ہم نے میونسپلٹی ایجاد کی۔میونسپلٹی کا ادارہ اب وجود میں آ گیا تو آ گیا۔یہ ممکن ہے کہ بنگلور میونسپلٹی کو آپ منسوخ کر دیجیے، ممبئ میں کیسے منسوخ کر دیجیے گا؟ سورت میں کیسے کیجئے گا؟ یہ تو ہر جگہ موجود ہے۔ادارہ آپ خود بناتے ہیں، پھر وہ ادارے قائم ہو جاتے ہیں اور اٹل ہو جاتے ہیں۔یہی تنقید کا قصہ ہوا۔نقاد صاحب استاد بن گئے تو بن گئے۔لیکن نقادوں کو چاہیے کہ وہ اپنی اوقات پر قائم رہیں۔وہ یہ نہ بھولیں کہ ان کا اثر عارضی ہے۔وہ کسی نہ کسی حد تک شاعر یا افسانہ نگار یا تخلیق کار، یا جو بھی نام لیجئے، اس پر کسی نہ کسی حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ محض ایک اتفاقی اور وقتی معاملہ ہے۔ورنہ کوئی تخلیقی فن کار ایسا نہیں ہے جس کی عمر نقاد سے زیادہ نہ ہو۔نقاد کی عمر کیا ہے بھئی؟ یہی برس دو برس چار برس۔یہ تو ہمارے آپ کے تہذیبی المیے کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ ''مقدمۂ شعروشاعری'' آج بھی پڑھائی جا رہی ہے۔اسے سو برس پہلے مٹ جانا چاہیئے تھا۔اور ہمارے عزیز دوست محمود ایاز صاحب نے جب ہمارا مضمون چھاپا اپنے رسالے میں تو پھر بہت ہی غصے میں لکھا کہ صاحب فاروقی صاحب ایسی باتیں کہہ رہے ہیں کہ شاعری میں خیالات وغیرہ وغیرہ کی اہمیت ہی کچھ نہیں ہے۔سب کچھ بیکار ہے، سوائے لفاظی کے۔

ہر طرف لفاظی ہی لفاظی نظر آتی ہے۔ اور ہمارے دوست مغنی تبسم نے اسی پرچے میں لکھا کہ جناب، ''مقدمۂ شعروشاعری'' آج بھی ہمارے لیے بامعنی اور معنی خیز ہے۔ تو یہ تو ہمارا المیہ ہے۔ یوں تو ان کتابوں کی اہمیت کیا ہے آج؟ کچھ بھی نہیں۔ بھئی آپ بتا دیجیے انگریزی میں یا فرانسیسی میں کون سی کتاب ایسی ہے جو سو برس پرانی ہے اور آج بھی پڑھی اور پڑھائی جارہی ہے؟ کوئی نہیں ہے۔ جو بہت بڑے بڑے وہاں کے نقاد ہیں مثلاً کولرج (S.T.Coleridge) ان کو بھی وہاں کوئی پڑھاتا نہیں ہے۔ لیکن وہ موجود ہیں، آپ پڑھ لیجیے۔ لیکن وہ کسی نصاب میں شامل نہیں کہ آپ یہ کہیں کہ پڑھنا پڑے گا کولرج کو۔ اب یہ الگ بات کہ آپ خود کو پڑھا لکھا آدمی کہلانا چاہتے ہیں، تو ضروری ہے کہ جانیں کہ کولرج کون سا بندہ تھا یا ڈاکٹر جانسن (Dr. Johnson) کون صاحب تھے؟ لیکن یہ کہ آپ کو جانسن یا کولرج پڑھایا جائے کلاس میں اور کہا جائے کہ اس پر یقین کیجئے کہ ان لوگوں نے جو لکھا ہے وہ صحیح لکھا ہے، یہ وہاں نہیں ہوتا تو بڑے سے بڑے نقاد کی عمر کیا ہے؟ دس برس، بیس برس، پچاس بس۔ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں، بار بار کہہ چکا ہوں کہ لوگ تو ایک شعر پر زندہ رہ جاتے ہیں، ایک نظم پر، ایک افسانے پر، ایک غزل پر زندہ رہ جاتے ہیں۔ یہ نقاد کس کھیت کی مولی ہے بھئی۔ پچیس یا بیس ہی برس پہلے کے کسی تنقیدی مضمون کا نام لیجئے جو آج بھی لوگوں کو یاد ہو۔ یا بجنوری کے سوا ایسے کسی شخص کا نام بتایئے جو محض ایک تنقیدی مضمون کے بل بوتے پر زندہ ہو۔ اور بجنوری بھی اپنے ایک نہایت غیر ذمہ دارانہ جملے کے باعث زندہ ہیں، تنقیدی مضمون کے سبب نہیں۔ وہ پورا مضمون تو شاید ہی کسی نے پڑھا ہو۔ یہ سب غلط بات ہے کہ یہ نقاد کا زمانہ ہے۔ نقاد کو چاہیے کہ وہ اپنی اوقات پر قائم رہے۔ اور بات یہ ہے کہ ہم لوگ پھول گئے ہیں، نقاد لوگ پھول گئے ہیں۔ میں تو خدا کا شکر ہے کہ نہیں پھولا، یا پھولا تھا تو پچک گیا ہوں۔ لیکن بہت سے نقاد ہیں جو پھولے ہوئے ہیں۔ تو وہ کب تک پھولے رہیں گے؟ میں تو کہتا ہوں کہ آپ انگریزی چھوڑ دیجیے، اردو ہی میں پچھلے پچاس سال کی تنقیدی کتابوں میں سے کسی دو کتابوں کے نام بتا دیجیے جن کو لوگ آج بھی پڑھتے ہیں، یعنی اپنی مرضی سے پڑھتے ہیں، کلاس کی مجبوری سے نہیں۔ بتا دیجیے دو نام، شاید بہت کھینچ کھانچ کے ممکن ہو سکے۔ کلاس کو چھوڑ دیجیے آپ۔ کلاس کے بعد، بی اے یا ایم اے کے بعد، کون سا ایسا مجموعہ تنقیدی

مضامین کا یا کون سی تنقیدی کتاب ہے جو پڑھی جاتی ہے؟ وہ کتابیں بھی جن کا بہت زور شور رہا، مثلاً ''اردو تنقید پر ایک نظر''، ''اردو شاعری پر ایک نظر''، ان کو کون پڑھتا ہے آج؟ پڑھتے نہیں ہیں لوگ۔ اگر تم شاعری کی دنیا میں داخل ہونا چاہتے ہو تو کیا تم یہ دیکھو گے کہ کیا لکھا ہے کلیم الدین احمد صاحب نے شاعری کے بارے میں؟ لکھا ہوگا تو لکھا ہوگا اپنی کتاب میں۔ ہم تو اپنا پڑھیں گے جو ہمیں پڑھنا ہے۔ تو تنقید کو اپنی حیثیت پر قائم رہنا چاہیے اور اگر کوئی سمجھتا ہے، نقاد ہو یا تخلیق کار، اگر وہ سمجھتا ہے کہ یہ زمانہ تنقید کا ہے تو فریب میں مبتلا ہے۔

اکرم نقاش : شاعری اور تنقید آپ کی اولین ترجیحات رہی ہیں۔ لیکن فکشن کی جانب آپ کی توجہ کے اسباب کیا ہیں؟ کیا یہ تخلیقی قوت کا تقاضہ تھا یا کوئی منصوبہ بند کارروائی؟

شمس الرحمٰن فاروقی : منصوبہ بند کارروائی سے ترقی پسند ادب تو پیدا ہوسکتا ہے، لیکن اور شاید کچھ نہیں۔ نہیں بھئی ہم تو شروع سے... بلکہ جب ہم پیدا ہوئے تھے لکھنے پڑھنے کی دنیا میں، تو ہم کو افسانہ نگار بننے کی تمنا تھی۔ ہم نے شروع میں افسانے لکھے بھی ہیں۔ اور یہ خیال تھا کہ ناول بھی لکھوں گا۔ مجھے تو ضرورتوں نے، مجبوریوں نے، افسانہ نگاری چھوڑنے پر مجبور کیا۔ جب میں نے دیکھا کہ تنقید بہت خراب لکھی جارہی ہے اور جو لوگ لکھ رہے ہیں اکا دکا کے علاوہ وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو تنقید نگار کہا جائے۔ تو میں نے کہا کہ لاؤ میں لکھ کے دکھاتا ہوں کہ کیسے لکھتے ہیں سخن ورسہرا۔ اس طرح میں پھنس گیا تنقید کے کاروبار میں، ورنہ تنقید کی طرف تو میرا کوئی خیال نہیں تھا۔ میں تو بنیادی طور پر افسانہ نگار ناول نگار بننا چاہتا تھا اور جب مجھے اللہ تعالیٰ نے موقع دیا تو وہ کام کر کے دکھایا آپ کو۔

اکرم نقاش : آپ کا کہنا ہے کہ آج جو ادب خلق ہورہا ہے وہ کچھ اور نہیں جدیدیت ہی ہے یا اس کا تسلسل۔ کیا پچھلے پچیس تیس سالوں کی تخلیقات میں اور جدیدیت کی حامل تخلیقات میں کوئی فرق نہیں ہے؟

شمس الرحمٰن فاروقی : ان معنی میں فرق ضرور ہے کہ آج کل جو لکھا جارہا ہے زیادہ تر، وہ اچھے ادب

میں شامل نہیں ہے۔ کیا نثر کیا نظم، کیا تنقید کیا شاعری، کیا افسانہ کیا ناول... میں تو اس کے بارے میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ یہ اچھا نہیں ہے۔ اچھا کیوں نہیں ہے اور اس میں کیا کمیاں ہیں؟ مثلاً یہ کہ آج افسانے میں بہت بڑی کمی یہ ہے کہ اس میں تخلیق اور تخیل کی کوئی کارگزاری نہیں ہے۔ جو کچھ اخبار میں نکل آتا ہے، یا ٹی وی پر ہم دیکھ لیتے ہیں، اس کو ہم لوگ افسانہ بنا لیتے ہیں۔ آج کا فکشن، اگر انگریزی اصطلاح استعمال کی جائے، تو Under imagined ہے۔ یعنی افسانہ نگار واقعے کو ننگا بوچا بیان کر دیتا ہے، اس میں تخیل کی آمیزش نہیں کرتا۔ جس چیز کو ادب کے لیے، کسی بھی ادب کے لیے انتہائی سم قاتل قرار دیا جاتا ہے وہ ہے موضوعات کا فقدان۔ دیکھ لو اپنے ہاں، افسانے پڑھ لو کسی رسالے میں۔ بس یہ دو تین موضوع ہوں گے: اول، عورتوں پر بہت ظلم ہو رہا ہے۔ بابا ہم مانتے ہیں کہ بہت ہو رہا ہے۔ ہم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ ظلم ہو رہا ہے۔ لیکن یہ بھی ظلم ہے کہ اس موضوع کو بیس تیس لوگوں نے ایک ہی طرح لکھ لکھ کر ادھ موا کر دیا ہے۔ دوسرا موضوع Terrorism ہے۔ مسلمانوں کو Terrorist کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو پولیس والے پیٹتے رہتے ہیں۔ تیسرا موضوع یہ کہ پالیٹیکس والے سب بدمعاش ہیں۔ جتنے سیاسی لوگ ہیں سب چور ہیں۔ ان موضوعات کو سرسری طور پر لکھا اور افسانے کے حق سے ادا ہو گئے۔ جہاں افسانہ نگار کی تخئیلی کارروائی اتنی محدود ہو چکی ہو تو کیسے کہہ سکتے ہو کہ افسانہ نگاری اچھی ہو رہی ہے؟ شاعری کو تم دیکھ لو۔ ایک تھوڑا تیکھا پن، تھوڑا سا ایک طنز کا پہلو، تھوڑی سی ایک طرح کی انانیت، اسی طرح کی آزادہ روی۔ اب اس میں چاہے شعر بنا کہ نہیں بنا، نظم بنی کہ نہیں بنی، بات ہوئی بھی کہ نہیں ہوئی، اس کی کسی کو پروا نہیں۔ جس ارتکاز اور قوت کی ضرورت ہے اس طرح کے انداز کو، وہ آج نہیں ہے۔ سبھی لوگ کہہ رہے ہیں کہ بس جو پرچہ آپ کھولیے ہر آدمی وہی لکھ رہا ہے۔ یا اور بہت زیادہ ترقی پر آئے تو مشاعرے میں چلے گئے۔ پھر شروع کر دیا کہ لڑکیوں کی شادی میں اپنا خون بیچ کر جہیز کا انتظام کیا۔ یا پھر یہ کہ اماں راستہ دیکھتی رہ گئی بچہ لوٹ کر نہیں آیا شہر سے۔ اور کیا ہوتا ہے آج کی شاعری میں؟ مانا کہ یہ خود اپنی جگہ ایک اہم بات ہے کہ ایسے موضوعات لائے جا رہے ہیں جو ادب میں پہلے نہیں تھے۔ لیکن ان موضوعات کے لائے جانے کا جواز بھی جدیدیت ہی ہے۔ جدیدیت ہی نے کہا کہ جو سمجھ میں آئے لکھو۔ جو تمھارا جی چاہے، جو

تمھارا باطن کہے، اس کو ظاہر کرو۔ لیکن جدیدیت نے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ ایک چیز کو بار بار کسی فنی اور کسی تخلیقی قوت کے اظہار کے بغیر کہے جائیے۔ کہے جائیے یہاں تک کہ تھک کے ہاتھ چور ہوجائیں۔ یہ تو نہیں کہا تھا جدیدیت نے۔ یہ کہا تھا کہ تخلیقی اظہار پر زور دیجیے۔ تو وہ زور نہیں نظر آرہا ہے مجھے، بس اتنا فرق ہے۔

اکرم نقاش : کہا جاتا ہے کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم کے سبب ہماری نئی نسل اردو سے دور ہوتی جارہی ہے لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ اس نسل میں کوئی انگریزی ادیب بھی مشکل سے نظر آتا ہے کیا یہ نسل زبان وادب کو کارزیاں سمجھتی ہے؟

شمس الرحمٰن فاروقی : میں اس بات کو نہیں مانتا کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم کی بنا پر لوگ انگریزی یا اردو میں ادب لکھنے سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ اردو سے دور ہونے کی، یا اردو کی صورت حال، آج جو اچھی نہیں ہے تو اس کے دو پہلو ہیں۔ اور ملک کے ہر حصے میں وہ پہلو برابر برابر نمایاں نہیں ہیں۔ مثلاً کرناٹک میں اردو کا حال یوپی سے پھر بھی بہتر ہے۔ کرناٹک میں اردو کا حال مدھیہ پردیش سے بہتر ہے، راجستھان سے بہتر ہے۔ بہار میں یا مہاراشٹرا میں اردو کا حال بہت ہی اچھا ہے۔ اس طرح الگ جگہوں پر الگ الگ ماحول ہے۔ آندھرا میں یا پرانا علاقہ حیدرآباد کا جو تھا جس میں آج کا کرناٹک بھی تھوڑا بہت شامل ہے، ایک حد تک تامل ناڈ بھی شامل ہے، وہاں اردو کی حالت یقیناً پہلے کے مقابلے میں اچھی ہورہی ہے۔ مغربی بنگال، دہلی، اور گجرات میں اردو کا حال غنیمت ہے لیکن ہر جگہ وجہ مختلف ہے۔ کشمیر میں تو خیر کچھ سرکاری زبان ہونے کا بھی فائدہ ہے۔ ہماچل پردیش میں اردو کی تعلیم آٹھویں درجے تک لازمی ہے۔ تو اردو کا حال مجموعی طور پر مایوس کن نہیں۔ لیکن جو چیز ہر جگہ نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اردو پڑھنے والے تو ہیں، لیکن اردو کے پڑھانے والے الا ماشاءاللہ اچھے نہیں ہیں۔ اردو کی تعلیم دینے والے اچھے نہیں ہیں۔ اردو کا یہ حال دراصل سوسوا ڈیڑھ سو برس کے تاریخی حوادث کا نتیجہ ہے۔ ہم لوگوں نے اپنی اصل اقدار کو نظرانداز کردیا۔ یہ میری نواسی نیساں فاطمہ جو آپ کے سامنے بیٹھی ہے، بی اے میں اردو پڑھتی ہے۔ اپنی کتابیں ساتھ لائی ہے اور مجھ سے پڑھ رہی ہے۔ اب میں

دیکھتا ہوں کہ حصۂ غزل میں اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، شاد عظیم آبادی، حسرت موہانی کے اس قدر پلپلے شعر ہیں کہ دل بیٹھ جاتا ہے۔ اکثر شعروں میں تو معنی ہی ٹھیک سے قائم نہیں ہوئے، یا پھر مضمون اتنا سستا اور معمولی کہ بچہ پوچھتا ہے، بات کیا بنی؟ یہ اسی وجہ سے کہ کتاب مرتب کرنے والے کو غزل کا شعور نہیں۔ خیر، غزل کی تو چھوڑ دیجیے۔ نظم کو دیکھئے کہ اتنے کم زور شعر... جوش صاحب کی نظم ''کسان''، جس میں ایک مصرع بھی اس قابل نہیں کہ آدمی اس کو یاد رکھے یا دل لگا کر پڑھے پڑھائے۔ پچاس شعر کی نظم پڑھائی جارہی ہے۔ میں بھی مجبوراً بیٹی کو پڑھا رہا ہوں کہ کورس میں ہے۔ وہ اسکول میں جاکے بتاتی ہے کہ ہمارے نانا کہتے ہیں کہ یہ نظم بہت خراب ہے تو اس کی اور جو ساتھی لڑکیاں ہیں، ناراض ہوتی ہیں۔ تو جو نسل ''کسان'' کو اچھی نظم سمجھتے ہوئے جوان ہوئی ہے وہ کیا پڑھائے گی؟ اس سے تم یہ کہو کہ جاؤ ''ذوق وشوق'' پڑھادو، یا ''مناجات بیوہ'' پڑھادو۔ قصیدہ اور مرثیہ تو دور رہا، شبلی کی ''عدل جہاں گیری'' ہی پڑھادو۔ تو وہ یہ بھی نہیں کر سکتے۔ کچھ ہے ہی نہیں ان کے پاس۔ یہ بڑا مسئلہ ہے۔ اب وہ نسل ہی نہیں رہ گئی ہے جو اردو پڑھانا جانتی ہو۔ کیوں کہ جو اقدار تھے ہماری شاعری کے، ان اقدار کو آہستہ آہستہ ہم لوگوں نے بھلا دیا اور یہ بڑی ایک کمی ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ اختر انصاری صاحب مرحوم بہت لائق آدمی تھے۔ اچھے شاعر تھے، اچھے افسانہ نگار تھے، اچھے استاد بھی رہے ہوں گے۔ کتاب ان کی بے انتہا مقبول ہوئی ہے۔ اس میں کہیں ذکر نہیں ہے کہ غزل یا کسی شعر کے معنی کیسے بتائیں گے؟

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

اس شعر کے کیا معنی ہیں اور وہ کس طرح بیان کیے جائیں گے، اس کا اس کتاب میں کوئی ذکر نہیں۔ گیان چند نے کہا کہ اس کو انگریزی میں ترجمہ کر دیا جائے تو یہ شعر مہمل اور معنی سے معرا ٹھہرے گا۔ یقیناً ہو جائے گا بھئی۔ انگریزی میں شعر لکھنے اور شعر کو بامعنی بنانے کے قاعدے کچھ اور ہیں، یہاں کچھ اور ہیں۔ بچہ اگر آپ سے پوچھتا ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ معشوق نے قتل کر دیا اور عاشق قتل ہوگیا؟ یہ کیسے ہورہا ہے، یہ کیا ہورہا ہے؟ ان سوالوں کا جواب آپ کے پاس نہیں۔ آپ یہی کہہ دیتے ہیں کہ اردو میں اس طرح

کی ''بکواس'' بہت ہے۔

کیا تم نے قتل جہاں اک نظر میں
کسی نے نہ دیکھا تماشا کسی کا

یہ شعر مومن کا ہے۔لڑکے لڑکیاں کہہ رہے ہیں کہ یہ کیا لغو بات ہے؟ بات یہ ہے کہ تم کو کسی نے بتایا ہی نہیں کہ اس طرح کے شعر کے پیچھے رسومیات کیا ہیں؟ استعارہ کیسے بنتا ہے، لفظ کو استعارے میں کیسے تبدیل کرتے ہیں؟ مضمون سے کیا مراد ہے، مضمون کی نوعیت کیا ہے؟ جب میں انھیں سمجھاتا ہوں تو حیرت کرتے ہیں کہ ہاں صاحب یوں بھی ہوسکتا ہے! آج کی زبان کو تم دیکھو۔ ہندی اتنی بھری چلی جارہی ہے، انگریزی کتنی بھری چلی جارہی ہے۔ پاکستان تک میں، جہاں ہندی نہیں ہے یہاں کی دیکھا دیکھی وہاں والے بھی ہندی کے الفاظ استعمال کررہے ہیں۔اب تو لوگ زبان ہی کی اصلاح نہیں، عقیدے کی بھی اصلاح کو زبان کے روزمرہ سے متعلق کرنے لگے ہیں۔الفاظ ہندی کے لکھ رہے ہیں اور اردو میں ''اللہ حافظ'' کہہ رہے ہیں۔ارے بھائی ''خدا حافظ'' کہو اللہ کے بندے۔اردو کے محافظ ہیں اور ''اللہ حافظ، اللہ حافظ'' کہہ رہے ہیں۔ یہاں والے بھی پاکستان کی دیکھا دیکھی ''اللہ حافظ'' کہہ رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں، قرآن میں ''خدا'' نہیں، ''اللہ'' ہے۔تو ہم کہتے ہیں کہ قرآن میں ''روزہ'' بھی نہیں، ''نماز'' بھی نہیں، ''صوم'' اور ''صلوٰۃ'' لکھا ہوا ہے۔اس کے کیا معنی ہیں کہ زبان کے تئیں تمھارا رویہ اتنا خراب ہوچکا ہے کہ تم اچھی زبان پہچانتے نہیں ہو؟ اگر تم سے کہا جائے کہ شبلی کا ایک پیراگراف پڑھ کے دکھا دو تو چکر میں آجاؤ گے کہ زبان ایسی لکھی جاتی ہے۔اتنی دل نشین، اتنی سادہ اور اتنی خوبصورت۔اگر واقعات کا بیان ہے تو اس میں بہاؤ دیکھ لو۔اگر ڈرامائی صورت حال ہے تو ڈراما دیکھ لو۔ جیسے کہ نبی اکرمؐ داخل ہوتے ہیں مدینہ منورہ سے مکہ معظّمہ میں حج الوداع کے دن، تو اس کا منظر دیکھ لو۔حضرت عمر کے سفر یروشلم کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک شخص اونٹ پر سوار چلا جارہا ہے اور صرف ایک آدمی اس کی محافظت میں ہے، لیکن سارے عالم میں غلغلہ ہے کہ مرکز عالم جنبش میں آگیا ہے۔تو اس طرح کے لکھنے والے ہیں۔ان کی قدر ہی اب نہیں ہورہی ہے۔اب نثر کے نام پر رشید احمد صدیقی کا مضمون ''چارپائی'' پڑھایا جارہا ہے، حالانکہ اب وہ سیاسی اور سماجی حوالے ہی نہیں رہ

گئے جن سے وہ مضمون بھرا پڑا ہے۔ لہٰذا اب اس مضمون کے ظریفانہ اور مزاحیہ پہلو تقریباً معدوم ہیں۔ اکثر بچوں نے تو وہ منظر بھی نہیں دیکھا جس پر اس مضمون کا دار و مدار ہے، کہ ایک چار پائی پر سارا خاندان پھیلا ہوا ہے اور زچگی سے لے کر موت تک سب واقعے اسی چار پائی پر پیش آتے ہیں۔ ایسے مضامین پڑھ کر اچھی نثر لکھنا کون طالب علم سیکھ سکتا ہے؟ رشید صاحب کی ایک سے ایک تحریریں موجود ہیں، لیکن کتاب بنانے والے استاد کو خبر ہی نہیں۔ اور انھیں یہ بھی خبر نہیں کہ ''چار پائی'' جیسی تحریریں آج پڑھا کر وہ بچوں کے ذوق نثر کو بگاڑ رہے ہیں۔ اردو زبان کا مسئلہ یہ ہے کہ اردو پڑھانے والے نہیں ہیں۔ میرے آپ کے جاننے والوں میں کتنے ہی لوگ ایسے ہیں کہ غیر ہندی تہذیب کے پیدا شدہ ہیں، جنھوں نے ایسے برہمن گھروں میں یا غیر مسلم گھروں میں آنکھ کھولی ہے جہاں اردو بالکل نہیں ہے۔ لیکن یہ لوگ اردو شاعری کے شوق میں اردو پڑھتے ہیں۔ یا شاعری کے شوق میں اردو پڑھتے ہیں، شعر کہتے ہیں۔ ہمارا جینت پرمار تو گجراتی بولنے والا ہے، لیکن اردو کا کتنا اچھا شاعر ہے؟ تم خود بھی دیکھ رہے ہو، اس جیسے لوگ ہر طرف موجود ہیں۔ بہت سے تو ہمارے الہ آباد جیسے شبستان تیرہ روز میں بھی ہیں جہاں جے پرکاش غافل جیسا ریاضی داں اور قانون داں ہے جسے اردو سے کچھ ملتا نہیں لیکن اردو شاعری کی محبت میں اردو سیکھتا ہے اور آج اعلیٰ درجے کی غزل اردو میں کہتا ہے۔ کمی اس کی ہے کہ ان کو اردو پڑھائے کون؟ انگریزی ذریعۂ تعلیم پہلے بھی تھا، اور اردو پڑھنے والے بھی تھے۔ آج جہاں جہاں اردو پہلے سے کم پڑھی جا رہی ہے اس کی وجہ انگریزی ذریعۂ تعلیم نہیں، والدین کی عدم دلچسپی ہے۔ حکومت کے سامنے منھ کھولے کھڑے رہنے کی ادا نے بھی اردو کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ زبان ہماری ہے، کیا یہ ہمارا فرض نہیں کہ ہم اس سے محبت کریں اور اس کی بقا اور ترویج کے لئے کوشاں ہوں؟ ●●

(مطبوعہ: اذکار 11۔ جون 2009 بنگلور)

(مشمولہ شمس الرحمٰن فاروقی کے انٹرویوز کا مجموعہ ''سو تکلف اور اُس کی سیدھی بات، 2015)

گوپی چند نارنگ

نام : گوپی چند نارنگ

پیدائش : 11/فروری 1931ء دُکی بلوچستان

تعلیم : ایم۔اے، پی ایچ ڈی (اُردو) دہلی یونیورسٹی

مصروفیت: 1) درس وتدریس، دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

2) وزیٹنگ پروفیسر وسکانسن یونیورسٹی، یونیورسٹی آف مینسٹو

3) وائس چیرمین آف دہلی اُردو اکاڈمی

4) وائس چیرمین آف این سی پی یو ایل

5) نائب صدر ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی

تصنیفات وتالیفات: 1) ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں 61-1959ء

2) کرخنداری اُردو کا لسانی مطالعہ (انگریزی) 1961ء

3) اُردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو 64-1962ء

4) ریڈنگز ان اُردو پروز (انگریزی) 68-1966ء

5) ارمغانِ مالک رام 1972ء

6) املا نامہ 1974ء

7) سانحۂ کربلا بہ طور شعری استعارہ 1990-1980ء

8) اُردو افسانہ روایت اور مسائل 1988-1981ء

9) انیس شناسی 1981ء

10) سفر آشنا 1982ء

11) اقبال کا فن 1983ء

12) لغت نویسی کے مسائل 1985ء

13) اسلوبیاتِ میر 1985ء

14) انتظار حسین کے بہترین افسانے 1986ء

15) نیا اُردو افسانہ : تجزیہ ومباحث 1988ء

16) راجندر سنگھ بیدی(انگریزی) 1988ء برائے ساہتیہ اکاڈمی
17) کرشن چندر(انگریزی) 1990ء برائے ساہتیہ اکاڈمی
18) ادبی تنقید اور اسلوبیات 1991-1989ء
19) امیر خسرو کا ہندوی کلام 2002-1990 (ہندی ایڈیشن 2006)
20) لینگویجز اینڈ لٹریچر (انگریزی) 1991ء
21) قاری اساس تنقید 1992ء
22) ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات 1993 اور 2007ء
23) بلونت سنگھ کے بہترین افسانے 1996ء
24) ذاکر حسین : حیات وخدمات 1998ء
25) مابعد جدیدیت پر مکالمہ 1999 اور 2012ء
26) اُردو پر کھلتا دریچہ (ہندی) 2000ء
27) اُردو کیسے لکھیں (ہندی) 2001ء
28) اُردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب 2002ء
29) بیسویں صدی میں اُردو ادب 2002ء
30) اطلاقی تنقید : نئے تناظر 2003ء
31) ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت 2004ء
32) جدیدیت کے بعد 2005ء
33) ولی دکنی : تصوف، انسانیت اور محبت کا شاعر 2005ء
34) اُردو کی نئی بستیاں 2005ء
35) اُردو زبان ولسانیات 2006ء
36) فکشن شعریات : تشکیل وتنقید 2008ء
37) فراق گورکھپوری : شاعر، نقاد، دانش ور 2008ء
38) کاغذِ آتش زدہ 2011ء

39) آج کی کہانیاں 2013ء
40) غالب : معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیاتا اور شعریات 2014ء
نوٹ: گوپی چند نارنگ صاحب کی تاحال 65 کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں اُن میں سے کچھ کتابوں کی تفصیل اوپر دی گئی ہے۔

انعامات واعزازات: 1) پدم شری ایوارڈ 1990ء
2) پدم بھوشن، برائے ادبی خدمات 2004ء
3) طلائی تمغۂ امتیاز برائے ادبی خدمات 1977ء (حکومتِ پاکستان)
4) ستارۂ امتیاز برائے ادبی خدمات 2012ء (حکومتِ پاکستان)
5) اعزازی ڈی لٹ سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد 2007ء
6) اعزازی ڈی لٹ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی حیدرآباد 2008ء
7) اعزازی ڈی لٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی 2009ء
8) بہادر شاہ ظفر ایوارڈ 2010ء
9) بھاشا پریشد ایوارڈ 2010ء
10) اقبال سمان مدھیہ پردیش اُردو اکاڈمی 2011ء
11) مورتی دیوی ایوارڈ، گیان پیٹھ نئی دہلی 2012ء
12) ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ 1995ء
13) غالب ایوارڈ 1985ء
14) راجیو گاندھی ایوارڈ برائے سیکولرزم 1994ء
15) دوحہ قطر فروغِ اُردو ادب ایوارڈ 2002ء

نوٹ: گوپی چند نارنگ جن انعامات واعزازت سے سرفراز ہوئے ان کی تعداد قریب 50 ہے جن میں سے کچھ اعزازات کی تفصیل اوپر دی گئی ہے۔

رابطہ : 09810112543

گوپی چند نارنگ سے ایک مکالمہ

اکرم نقاش : ایسی مثالیں بہت کم ہیں کہ کوئی نقاد محقق یا ادیب تخلیق کے راستے ادب میں داخل نہ ہوا ہو۔آپ نے بھی شروعات افسانے سے کی، پھر آپ کی ترجیحات بدلنے کے اسباب کیا ہیں؟

گوپی چند نارنگ : ادب میں کون کس راستے سے داخل ہوتا ہے اس کا کوئی بندھا ٹکا اصول نہیں۔ ہر طرح کی مثالیں ہیں۔ کچھ حالات ایسے ہوتے ہیں کہ آپ کا رخ موڑ دیتے ہیں، پھر اندر کی آگ کا معاملہ بھی ہے۔ انسان جتنا مختار ہے اتنا مجبور بھی ہے۔ طبیعت کا کوئی رجحان بنتے بنتے بنتا ہے۔ تخلیقیت بھی برحق اور مشقت و ریاضت بھی برحق لیکن ادب میں مشقت و ریاضت سے جلا آتی ہے۔ میں نے کہیں لکھا ہے کہ جب میں نے دلی کالج میں داخلہ لیا تو استاد نے نصیحت کی کہ اگر اکیڈمک دنیا میں کام کرنا اور اپنی شناخت کو منوانا ہے تو پھر تنقید و تحقیق پر توجہ کیجیے یک در گیر و محکم گیر، بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے ہر ناند میں منہ مارتے ہیں یہ مجھے کبھی پسند نہیں تھا۔ ایم اے کے زمانے میں میں نے ایک مضمون لکھا 'اکبرالہٰ آبادی ہندوستان اور پاکستان میں' جسے 'نگار' لکھنو کو اشاعت کے لیے بھیجا۔ نگار اس زمانے میں صف اول کا پرچہ تھا، اس میں فقط جید نام ہی نظر آیا کرتے تھے۔ نیاز فتح پوری نے مضمون فوراً شائع کر دیا۔ مضمون چھپا تو واہ واہ ہوئی۔ اسی زمانے میں مشفقی خواجہ احمد فاروقی کے ساتھ مل کر قدیم دلی کالج نمبر ایڈٹ کیا اور اس کے لیے بھی مضامین لکھے جن کی پذیرائی ہوئی۔ میرے چاہنے نہ چاہنے کو اتنا دخل نہیں تھا۔ شروع کی کچھ کامیابیاں ہوتی ہیں، کچھ حالات کا تقاضا انسان کی راہ کا تعین ہو جاتا ہے۔ میرا اصول ہے جس

میدان میں کام کرو،بہترین کام کرو۔میرے اندر کا شاعر مرا نہیں ہے۔آج بھی وہ میرے ساتھ ہے۔شاعر ہونا برحق ہے تو شاعری کا پارکھ اور رسِک ہونا بھی برحق ہے۔اصل چیز ادبی حسیت ہے۔ادبی حسیت تخلیق کا جوہر ہے تو تنقید کا بھی۔تنقید بھی وہی اپنی حیثیت منوا سکتی ہے جو ادبی حسیت کے جوہر سے متصف ہو۔یہ نہ ہو تو تبصرے تقریظیں لکھتے رہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔

اکرم نقاش : آج کا ادب ایک طرح کی یکسانیت کا شکار نظر آتا ہے،توانا تخلیقیت اور انفرادیت کے حامل فن کاروں کی تلاش آج آسان نہیں ہے جب کہ ماضی قریب میں مذکورہ خصوصیات کے حامل قلم کاروں کی ایک کہکشاں نظر آتی ہے۔تخلیقی وفور،تجربہ پسندی کی کمی اس کا سبب ہے یا کچھ اور؟

گوپی چند نارنگ : ادب شاید یکسانیت کا شکار نہیں البتہ تخلیقی وفور کی کمی ہے۔بڑے فن کار ایک ایک کر کے اٹھ چکے ہیں۔صفیں کی صفیں خالی ہو گئی ہیں۔لیکن ادب میں فقط چوٹیاں ہی نہیں ہوتیں وادیاں بھی ہوتی ہیں۔ایک غالب کے بعد دوسرا غالب آئے،شیکسپیئر کے بعد دوسرا شیکسپیئر آئے ضروری نہیں۔ادب کی تاریخ نشیب و فراز کا کھیل ہے۔البتہ یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ آج ہم نشیب میں نسبتاً زیادہ کیوں ہیں۔سامنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ جدیدیت جو ذہنوں کو آزاد کرنے والا اور متن کی تخلیقیت پر اصرار کرنے والا روشن ضمیری کا رجحان تھا،جو خلیل الرحمٰن اعظمی،محمود ایاز کے زمانے تک صحیح پنپتا رہا،لیکن بعد میں جب اس کو خانہ زاد کر کے اس میں ایک طرح کی ہیئتی شدت داخل کی گئی اور بیگانگیت،ذات پرستی،لایعنیت اور سماجی مسائل سے بے تعلقی اور میکانکی ہیئت پرستی پر زور دیا گیا تو اس میں دورائے نہیں کہ تخلیقی وفور کو نقصان پہنچا۔ادب نہ صرف قاری سے کٹ گیا اس میں زندگی کی حرارت بھی کم ہو گئی۔اس بے تعلقی کے کچھ اثرات اب بھی باقی ہیں۔ادھر یہ بھی ہے کہ ادب جب جب اس اندھیری گلی سے نکلنا چاہتا ہے یا تخلیقی وفور کی کوئی لہر آتی ہے تو جم کر مخالفت کی جاتی ہے اور الٹی سیدھی بقراطیت بگھاری جاتی ہے۔لیکن یہ حالت ہمیشہ رہنے والی نہیں۔ادب کا اپنا ایک اندرونی حرکیاتی نظام ہوتا ہے۔ایک نہ ایک دن وہ

منزل آتی ہے جب ادب اپنے زوال کی فضا سے خود نبرد آزما ہوتا ہے اور اس سے باہر نکل آتا ہے۔

اکرم نقاش : پچھلے 80-70 برسوں کے ادب پر نظر کی جائے تو تحریکات ورجحانات اور ادبی ہنگاموں کی کئی دنیائیں نظر آتی ہیں، ادبی ہنگامہ خیزی آج کے ادب کا مقدر کیوں نہیں بن پارہی؟

گوپی چند نارنگ : آپ کے اس سوال کا کچھ جواب اوپر آچکا ہے۔ ادبی ہنگامہ خیزی آج بھی ہے۔ لیکن اس کی نوعیت دوسری ہے۔ سامنے کی بات ہے کہ ترقی پسندی روایتی ادب کی ضد میں آئی تھی اور دونوں میں ٹکراؤ شدید تھا۔ پھر جدیدیت ترقی پسندی کی ضد میں آئی اور ترقی پسندی و جدیدیت میں بھی ٹکراؤ شدید تھا۔ خوب خوب ایک دوسرے کے لتے لیے گئے۔ اب مابعد جدیدیت جدیدیت کے اس طرح سے خلاف نہیں ہے بلکہ جدیدیت کے بعد کا فلسفہ ہے اور اس کی کوتاہیوں سے بچنے نیز اپنے ثقافتی تشخص پر اصرار کرنے اور فن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے کشادہ آئیڈیالوجی، سماجی مسائل اور زندگی کی ہماہمی سے جڑنے کا فلسفہ ہے۔ اس میں معنی کی تکثیریت کو لے کر یا ردتشکیل کو لے کر یا آئیڈیالوجی کو لے کر گہری بحثیں اٹھائی گئی ہیں جو یکسر علمی اور فلسفیانہ ہیں۔ خانہ زاد جدیدیت نے جب ابلاغ کے نام پر رعایت لفظی، مناسبت لفظی اور اشکال پسندی کا چکر چلایا تو لوگوں نے گہرے جمالیاتی و آئیڈیالوجیکل مسائل پر غور کرنا بند کردیا۔ جب بھی تھوڑا بہت نظریاتی ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے تو بہ جائے نظریاتی بحثیں اٹھانے یا نظریاتی علمی سطح پر ان کا جواب دینے کی کوشش کرنے کے اشرف علی تھانوی کو آگے کردیا جاتا ہے یا کج بحثی کر کے مسائل کا رخ ذاتیات کی طرف موڑ دیا جاتا ہے اور نہ صرف مغلظات سے نوازا جاتا ہے بلکہ کردارکشی سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ اس سے ادب کا فائدہ ہو رہا ہے کہ نقصان۔ مزید یہ کہ فرقہ واریت جس کی ترقی پسندی نے جم کر مخالفت کی تھی اور جو جدیدیت کا سرے سے مسئلہ ہی نہیں تھی اس لیے کہ سوائے ذات کے کوئی سماجی مسئلہ ادبی مسئلہ نہیں تھا، چناں چہ اب کھلم کھلا فرقہ واریت کو بڑھاوا دیا جاتا ہے اور اپنی

ساکھ بنائے رکھنے کے لیےاس کوایک کارگرحربے کےطور پراستعمال بھی کیاجاتا ہے۔اس بات سےشاید ہی کسی کواختلاف ہو کہ یہ چھپاہوافاشزم ہے جونظریاتی اختلاف کے نام پر پرورش پارہاہےاوراردو جوروشن ضمیری، ذہنی بیداری، رواداری واتحادوآشتی کی زبان تھی اس میں زہر پھیلایاجارہاہے۔اردو میں یکسر اندھیرا ہوایسا بھی نہیں، کچھ لوگوں کواس افسوس ناک صورت حال کا احساس ہے اور انہوں نے اس کے خلاف آواز بھی اٹھائی ہے۔

اکرم نقاش : زندہ ادیبوں پراظہارخیال اوران کے نام گنوانے سے اکثر نقاد بھی گریز کرتے نظر آتے ہیں جبکہ یہ بات تنقیدی منصب کے منافی بھی نہیں۔اورادب بہرحال کوئی شخصی معاملہ نہیں ہے پھراس احتیاط اورگریز کوکیانام دیاجائے؟

گوپی چند نارنگ : ایسانہیں ہے کہ زندہ ادیبوں پر اظہار خیال بالکل نہیں کیاجاتا۔لیکن جتنا ہونا چاہئے اتنانہیں ہے۔اس کی وجہ بھی وہی بے گانگی اور اپنے خول میں بند ہونا ہے۔ رسالےموجود ہیں، بڑےادیبوں کی سرپرستی بھی انھیں حاصل ہےلیکن اگرترجیحات ہی منفی ہوں گی تو مثبت کام کیسے ہوگا۔اس وقت اردو ادب محدودنوعیت کے vested interests کی آماج گاہ بناہواہےاورزندہ ادیبوں کواگرشکایت ہےتو بےجابھی نہیں۔ لیکن زوال کے زمانے میں ایک اور میلان جوفروغ پاتاہے یہ کہ ہرزندہ ادیب یہ سمجھتاہے کہ وہی خلاصۂ کائنات ہے۔اس وجہ سےبھی تنقید سے شکایت عام ہوگئی ہے۔ آل احمدسرور،احتشام حسین،محمدحسن عسکری کےزمانے میں جوتنقیدکی ساکھ تھی،جدیدیت کےزمانے میں اس کونقصان پہنچاہے۔ادعائیت،خود پسندی،اپنی حقانیت پراصرارتنقید میں عام ہے۔اس کےذمہ دارکون لوگ ہیں، بتانے کی ضرورت نہیں۔پاکستان میں تنقید کا حال اوربھی پتلاہے۔بہ ہرحال وہاں تھوڑابہت تخلیقی وفورتو ہے کیوں کہ وہاں کا اردو ادب وہاں کےسماجی سیاسی مسائل سےالگ تھلگ نہیں رہا۔یونیورسٹیاں بڑھ رہی ہیں، کالج بڑھ رہے ہیں، طالب علم بڑھ رہے ہیں لیکن اسپرٹ آف انکوائری کی وہاں شدید کمی ہے۔وہاں کی وجہیں دوسری ہیں، یہاں کی وجہیں دوسری،جن کی طرف کچھ اشارہ اوپرکیاگیا۔

اکرم نقاش : عہد حاضر میں شاعری، فکشن اور تنقید کے اہم نام کون ہیں؟

گوپی چند نارنگ : یہ سوال آپ نے بہت سے لوگوں سے پوچھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انھیں کو پڑھ لینا کافی ہے۔ کسی انٹرویو میں نام شماری اچھی بات بھی نہیں۔ میرے بھی کچھ پسندیدہ نام ہیں بر بنائے صلاحیت وقابلیت، نہ کہ بر بنائے گروہ بندی وطرف داری۔ میری ترجیحات آپ کو میری تحریروں اور مضامین میں مل جائیں گی۔

اکرم نقاش : رسالہ سوغات اور مدیر محمود ایاز کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

گوپی چند نارنگ : محمود ایاز کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ جدیدیت کے ہراول دستے میں ان کا نام ہمیشہ خلیل الرحمن اعظمی کے ساتھ لیتا ہوں۔ وہ شاعر بھی تھے لیکن بحیثیت ادبی مدیر ان کی حیثیت زیادہ راسخ ہے۔ سوغات کے نظم نمبر کو کوئی فراموش نہیں کر سکتا۔ ان کے مزاج میں خود پسندی تھی لیکن ادبی معاملات میں وہ ڈنڈی نہیں مارتے تھے۔ انہوں نے بزرگوں کا بھی احترام کیا اور نوجواں کے لیے بھی دروازے کھلے رکھے۔ بہت دیر تک صحت مند جدیدیت کو استوار کرنے میں سوغات کا تاریخی کردار رہا ہے۔ سوغات کا نام اس دور کے 'صبا'، 'سویرا'، 'سات رنگ'، 'ہماری زبان' کے ساتھ لیا جائے گا بلکہ ان سب سے پہلے لیا جائے گا۔ بیچ میں وہ ادب سے کنارہ کش ہو گئے تھے اور کسی قدر قدامت پسند بھی۔ جس زمانے میں میں تھیوری پر کام کر رہا تھا، میرے ان سے کچھ نظریاتی اختلافات بھی تھے۔ ان کے بعض خاصے طویل خطوط میرے پاس ہیں۔ میرا اصرار تھا کہ کسی چیز سے اختلاف کرنے سے پہلے اس کا سمجھنا بھی بہت ضروری ہے۔ تھیوری کی بہت سی انتہا پسندانہ باتوں کے باطن میں اتر کر انھیں سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے تبھی آپ انھیں رد کر سکتے ہیں۔ ان کی بڑائی ہے کہ اس کے باوجود انھوں نے میری بہت سی بحث انگیز چیزوں کو شائع کیا۔ سوغات کے اس دوسرے دور میں بالآخر انھیں خود احساس ہونے لگا کہ جس جدیدیت کی لوگ حمایت کرتے رہتے ہیں تو کلاسیکیت کے نام پر وہ ایسی انتہا پر پہنچا دی گئی ہے جہاں

اس کے پاس رعایت لفظی، مناسبت لفظی یا ہیئتی کاریگری کی بحثوں کے سوا کچھ نہیں رہ گیا۔ تہذیبی جڑوں کے فقدان کا بھی ان کو احساس تھا۔ چنانچہ زندگی کے مسائل سے جڑنے کی ضرورت اور سماجی بے تعلقی کے عمومی منظرنامے سے خود ان کو تکلیف ہونے لگی تھی۔ ثبوت کے طور پر ان کے وہ خطوط پڑھیے جو انھوں نے شمس الرحمٰن فاروقی کے رویوں کے خلاف مغنی تبسم کو لکھے اور ان سے اس نوع کی نری ہیئتی و میکانکی ہیئت پرستی کے خلاف مضمون لکھنے کی فرمائش کی جو بعد میں سوغات میں چھپا۔ لیکن یہ وہ زمانہ ہے جب نقصان پہنچ چکا تھا۔ جس کے خلاف باقر مہدی اور وارث علوی جیسے لوگ باتیں تو بہت بناتے تھے لیکن کسی نے جم کر نہیں لکھا۔ تھیوری کے مباحث نے جب معنیاتی ثقافتی و آئیڈیالوجیکل موقف کو پوری طرح راسخ کر دیا تو سب سکتے میں آ گئے۔ اس لیے کہ سب اپنی اپنی جگہ سجادہ نشین ہو چکے تھے۔ افسوس کہ محمود ایاز کی صحت خراب رہنے لگی اور پھر وہ چل بسے۔ کاش وہ زندہ رہتے تو اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ جو موقف اپنی سلیم الطبعی کی وجہ سے انہوں نے اختیار کیا تھا وہ اردو کے قافلے کو اس راہ پر بڑھانے کے لیے ضروری تھا۔

اکرم نقاش : آپ ہمارے عہد کی بے حد اہم ادبی شخصیت ہیں آپ کا شمار جدیدیت کے رہنماؤں میں ہوتا رہا ہے۔ آپ نے جدید شاعروں جیسے شہر یار، محمد علوی، بانی، ساقی فاروقی، افتخار عارف پر مضامین لکھے، جدید افسانوں کے تجزیے اور فکشن پر آپ کی تنقید اپنی مثال آپ ہے، اس سب کے باوجود جدیدیت سے خود کو علاحدہ کرنے کے اسباب کیا ہیں؟

گوپی چند نارنگ : آپ کو معلوم ہے کہ میں نے جم کر جدیدیت کا ساتھ دیا۔ لیکن فیشن گزیدہ یا ہیئت پرستی والی خانہ زاد جدیدیت سے میری راہ ہمیشہ الگ تھی۔ میں اردو کی تہذیبی جڑوں پر 1960 سے پہلے کام کر چکا تھا اور اردو مثنویوں پر میری تحقیقی کتاب شائع ہو چکی تھی۔ پھر میں اسلوبیات کی طرف نکل گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب فکشن اور شاعری پر میرے بعض مضامین کو بہ فضل اتنی پذیرائی ملی کہ خود مجھے حیرت ہوتی تھی۔ ابھی میں اپنی پرانی تحریریں ایڈٹ کر رہا تھا تو میری نظر سے ایک نوٹ گزرا، کچھ جدید افسانے کے بارے میں جو 1969 میں 'شب خون' میں شائع ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب میں وسکانسن میں تھا۔ اس

میں میں نے جدید افسانے کے شاعری کی زبان بن جانے پر اعتراض کیا ہے اور دوٹوک لفظوں میں ایک سمپوزیم کے شرکا کو جن میں شمس الرحمٰن فاروقی، بلراج کومل، محمود ہاشمی شریک تھے، کہا تھا کہ شاعری کا منصب اور ہے اور افسانے کا اور۔ افسانے کی شعرزدگی اس کے لیے خطرہ ہے اور اگر افسانہ زندگی کی جڑوں اور سماجی معنویت سے بےتعلقی اختیار کرتا ہے تو صورت حال مضحکہ خیز ہوجائے گی۔ یاد رہے کہ میں خود سریندر پرکاش اور بلراج مین را کی اچھی علامتی کہانیوں کا مداح رہا ہوں لیکن جب شاعری کی زبان میں لکھا ہوا افسانہ خود افسانہ کا منہ چڑانے لگا تو میں نے 1980 والے جامعہ کے فکشن سمینار میں اس کی مخالفت میں کھل کر آواز اٹھائی۔ میری کتاب 'اردو افسانہ: روایت اور مسائل، کے آخری مضمون کا عنوان ہے،''علامتی وتجریدی افسانہ: مقلدین کے لیے ایک لمحۂ فکریہ''، گویا یہ ایک واضح گریز تھا۔ اس کے بعد جیسے جیسے میں تھیوری کے بطون میں اترتا گیا مسائل کی گرہیں کھلتی گئیں کہ خانہ زاد جدیدیت روشن ضمیری کے پروجیکٹ سے گریزاں ہے۔ میرے مخالفین کو بھی اس کا احساس تھا کہ اب ان کی پوزیشن Tenable نہیں رہی۔ مجھے نہ مخالفت کی پروا ہے نہ سازشوں کی۔ اتنا معلوم ہے کہ میں مخلص ہوں اور جو بات کہہ رہا ہوں وہ ایمان داری، گہرے مطالعے، بھگتے ہوئے تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں اور میں ہی نہیں ساری دنیا اس کو جانتی ہے کہ جس جدیدیت کو خانہ زاد کیا گیا اس کا دنیا میں اب کہیں وجود نہیں۔ کچھ پرانے نام لیوا ہیں جو لکیر پیٹے جارہے ہیں۔ ایسے نام لیوا تو روایتی ترقی پسندی کے بھی ہیں۔ کون کہہ سکتا تھا کہ سچا مارکزم وہ ہوگا جو پارٹی فارمولوں کے ساتھ نہیں بلکہ کشادہ آئیڈیالوجیکل سروکاروں کے ساتھ آئے گا۔ ہندوستان جیسے تکثیری معاشرے میں نہ تو کبھی فرقہ واریت کامیاب ہوسکتی ہے نہ فاشزم۔ میں اب 80 سے تجاوز ہوں، اردو میں قدامت پسندی کے نام پر چور دروازے سے جس فاشزم کو داخل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ میری آواز نحیف ونزار سہی، میں ان لوگوں کی زد پر سہی، لیکن میں فاشزم یا فرقہ واریت کو بڑھاوا دینے والی قدروں سے سمجھوتہ نہیں کرسکتا۔

اکرم نقاش : ترقی پسندوں کی ادعائیت اور منشوری ادب پر اصرار جدیدیت کے فروغ کا جواز تھا، جدیدیت کی فیشن پرستی اور حد سے بڑھی ہوئی تجربہ پسندی بھی اعتدال کی راہ پر لگ گئی

تھی۔ایسی صورت میں مابعد جدیدیت کے اعلان واطلاق کا ادبی جواز کیا ہے؟ جدیدیت اور مابعد جدیدیت میں خط فاصل کیا ہے؟

گوپی چند نارنگ : اعتدال کی بھی خوب رہی۔ ہر چیز کی ایک اساس ہوتی ہے۔سوچنا چاہیے پیراڈائم کیوں بدلا؟ جدیدیت اور مابعد جدیدیت میں جو خط فاصل ہے اس کا بھی کچھ اندازہ اوپر کی بحث سے ہوگیا ہوگا۔ یوں بھی یہ بحث اس نوعیت کی ہے کہ دو چار جملوں میں اس کے بارے میں کچھ کہا جائے تو ایک طرح کا over simplification اور reductionism ہے۔ جن لوگوں کو دل چسپی ہے وہ میری کتابیں 'مابعد جدیدیت پر مکالمہ' اور 'جدیدیت کے بعد' میں میرے بعض مضامین میں دیکھ سکتے ہیں۔ یوں بھی میں پوچھنا چاہوں گا کہ جدیدیت کے عروج کے زمانے میں تہذیب کا کوئی نام نہیں لیتا تھا۔ تہذیبی قدر، تاریخی قدر، سماجی قدر، سب باہری قدریں تھیں اور داخلی قدریں ہیئتی قدریں تھیں لیکن آج جدیدیت کے غالی علم بردار تہذیبی اور تاریخی ڈسکورس قائم کرتے نظر آتے ہیں، کیوں؟ بے شک بیانیہ کہیں نہیں گیا تھا اور کہانی پن بھی کہیں نہیں گیا تھا لیکن کیا کوئی اس سے انکار کرسکتا ہے کہ سکہ بند جدیدیت کے زمانے میں جدید افسانے کا جو نظریاتی فریم ورک بنایا گیا اس میں واضح طور پر کہانی پن اور کردار نگاری کا اخراج کیا گیا۔ کیا آج کا بیانیہ کہانی پن کی طرف راجع نظر نہیں آتا۔ وہی لوگ جو اسٹوری لائن کی نفی کرتے تھے اور جدید افسانے کے تصور سے کردار نگاری کا علی الاعلان اخراج کرتے تھے کیا آج وہ اپنی سابقہ روش پر قائم ہیں؟ کیا تہذیبی تاریخی ڈسکورس فکشن میں واپس نہیں آچکا؟ پوسٹ کلونیل ازم کے نام پر جس تہذیبی تشخص پر اصرار کیا جاتا ہے وہ جدیدیت کے زمانے میں کہاں تھا؟ مزید یہ کہ جس طرح متن کی تکثیریت اور معنی کی تعبیروں پر اصرار کیا جاتا ہے اور ڈھوکی ڈھوشرحیں لکھی جاتی ہیں، کیا جدیدیت کی وحدانی معنویت کی فضا میں ان کا کوئی جواز تھا؟ مزید یہ کہ ترقی پسندی کے رومانی منشائے مصنف کو تو رد کیا گیا لیکن متن کو خودمختار قرار دے کر جس طرح قاری کا اخراج کیا گیا، کیا آج اخذ معنی کی تعبیر و تشریح میں علاوہ متن و مصنف کے قاری کی کارکردگی کا جواز فراہم نہیں ہوگیا؟ باتیں بیسیوں ہیں۔ مزید دو بڑے مسئلے تانیثیت اور دلت وِمرش کے بھی ہیں۔ ہمارے یہاں

دلت نہ سہی، فرقہ، برادری، عقیدہ، مسلک کے نام پر فاشزم تو ہے۔ یہ سب سماجی سروکار کی بحثوں کی ضمنی جہات ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ یہ سارا ڈسکورس مابعد جدیدیت کی شقوں کے طور پر سینٹر اسٹیج ہو چکا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہی لوگ جو نظریاتی طور پر سکہ بند جدیدیت کے امام تھے، وہ سب آنکھیں بند کر کے ان باتوں کو تسلیم کرتے ہیں اور ڈھٹائی یہ بھی کہ بہ ادعا یہ کہتے ہیں کہ کوئی تبدیلی نہیں آئی گویا brain wash کرتے ہیں اور نوجوانوں کو گم راہ کرتے ہیں۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ ایک طرح کی ادبی بددیانتی ہے۔

اکرم نقاش : شاعری، لسانیات، اسلوبیات کے ساتھ ساتھ فکشن کی تنقید بھی آپ کی اہم تنقیدی جہت ہے، پریم چند، منٹو، بیدی، انتظار حسین، بلونت سنگھ، بلراج میزا، سریندر پرکاش، منشا یاد وغیرہ کے افسانوں پر آپ کے مضامین و تجزیے نہ صرف ان افسانوں پر بے مثل تحریریں ہیں، فکشن کی تنقید پر آپ کی مضبوط گرفت کے آئینہ دار ہیں۔ نیر مسعود فکشن کا ایک اہم اور منفرد نام ہے۔ نیر مسعود کے افسانوں کے بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہوں گا؟

گوپی چند نارنگ : نیر مسعود بے شک فکشن کا اہم اور منفرد نام ہے۔ ان کو بھی اسی تہذیبی ڈسکورس کی اگلی کڑی کے طور پر دیکھنا چاہیے جہاں قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین اپنی اپنی انفرادی شان سے جلوہ گر ہیں۔ یاد رہے کہ قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کو جدیدیت کے بعض چودھریوں بہ شمول وارث علوی، باقر مہدی، شمس الرحمٰن فاروقی قبول نہیں کیا تھا۔ یقین نہ آئے تو وارث علوی کا 'اساطیر کی گائے گوبر دیتی ہے' پڑھ لیجئے۔ آج کے عہد کا ایک رجحان Magic Realism بھی ہے۔ اس کی کچھ نشانیاں قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے یہاں پہلے سے پائی جاتی ہیں۔ نیر مسعود کا فن تمام و کمال اسی سے عبارت ہے۔ ان کا بیانیہ ثقافتی بیانیہ ہے۔ ان کے بیانیہ کو جادوئی حقیقت نگاری یعنی اس کی ایک منفرد مشرقی ثقافتی وضع سے مناسبت طبعی ہے۔ لیکن افسوس کہ بالآخر وہ ماضی کے نوحہ گر بن کر رہ جاتے ہیں۔ کاش وہ بند گلی سے باہر نکل سکیں۔ بہ ہر حال جس میں جو بھی ہو کمال اچھا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا برسوں پہلے ساہتیہ اکادمی نے اپنے ایوارڈ سے ان کی اہمیت کا اعتراف کیا تھا۔

اکرم نقاش : پچھلے پچاس، ساٹھ سالہ ادب کی حاوی صنف کون سی ہے۔ اس کے اسباب ومحرکات کیا ہیں؟

گوپی چند نارنگ : ویسے دیکھا جائے تو اکیسویں صدی فکشن کی صدی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ پچھلی صدی میں فکشن بالخصوص افسانے نے نہ صرف اپنی حیثیت کو منوایا بلکہ فنی بلندیوں کو بھی چھولیا۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو میں شاعری حاوی ہے اور شاعری میں غزل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ قصیدہ، مثنوی، مخمس، مستزاد سب پس پشت چلے گئے۔ پچھلی صدی میں نظم کی ہیئتوں یعنی نظم معرا اور نظم آزاد نے اپنی حیثیت کو منوایا اور مقبولیت کے درجات بھی طے کیے۔ غزل پر سخت سے سخت اعتراضات کیے گئے لیکن جیسا کہ میں نے اپنی کتاب میں دکھایا ہے غزل کی جڑیں ہمارے مخلوط تہذیبی عوامل میں دور دور تک پیوست ہیں۔ غزل ہندوستانی سائیکی میں رچی بسی ہے۔ غزل کا جینئس ہندوستانی ذہن ومزاج کو راس آتا ہے اور ناقابل بیان جمالیاتی آسودگی بخشتا ہے۔ وہ ہماری روحانی Heritage کا بھی حصہ ہے۔ اسی لیے باوجود سخت سے سخت اعتراضات کے غزل کا احیا ہوا اور اس کو نئی مقبولیت حاصل ہوئی اور غزل نے نئے آئیڈیالوجیکل وثقافتی وسماجی تقاضوں کا ساتھ بھی دیا۔ لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ادھر روایتی اور رسمی غزل کی یلغار ہے۔ غزل میں اپنی آواز پانا جتنا مشکل ہے رسمی اور روایتی شعر کہنا اتنا ہی آسان ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اچھی اور تازہ کار آوازیں موجود ہیں لیکن روایتی شاعری وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ نظم پر جیسی اور جتنی توجہ ہونا چاہئے نہیں ہے۔ یہ خوش آئند نہیں۔ نظم کے اچھے شاعر آج کے منظرنامے پر بہت کم ہیں۔

اکرم نقاش : مظہر امام صاحب نے کہیں لکھا ہے کہ پروفیسر نارنگ دوستی کے سلسلے میں جتنے کھرے ہیں دشمنی کے معاملے میں بھی اتنے ہی پکے ہیں، بڑے اہتمام اور جتن کے ساتھ یوں دشمنی کرتے ہیں جیسے شطرنج کھیل رہے ہوں۔ اس بیان میں کہاں تک صداقت ہے؟

گوپی چند نارنگ : یہ جملہ مظہر امام کا نہیں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ جملہ مجتبیٰ حسین کا ہے اور انہوں

نے مزاح کے پیرایے میں لکھا ہے۔مزاح کو سنجیدگی سے لینا ادب فہمی کے خلاف ہے۔ البتہ مصلحت بینی میرے مزاج کا حصہ نہیں اور حق بات میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں۔ جس طرح کی سازشیں لوگ کرتے رہتے ہیں اس سے میں مزاجاً نفور ہوں۔ میں سب کو دوست سمجھتا ہوں حتیٰ کہ کوئی خود یہ ثابت نہ کردے کہ وہ دوستی کے قابل نہیں۔مظہر امام نے تو یہ لکھا ہے ''دونقادوں کی دوستی فطری نہیں۔ پھر بھی ان دونوں (نارنگ اور فاروقی) کی دوستی مثالی رہی ہے''۔آپ کوئی واقعہ ایسا پیش نہیں کرسکتے جب میں نے کسی سے دشمنی میں پہل کی ہو۔خدا کا شکر ہے اس نے محسود بنایا ہے کسی کا حاسد نہیں بنایا۔لوگ اپنی اپنی مفاد پرستی، رشک ورقابت یا چھپی ہوئی فرقہ واریت کی بنا پر سازش کرتے ہیں تو بھی میں کسی کا جواب ذاتی سطح پر نہیں دیتا۔نظریاتی اختلاف ہو تو ضرور اپنی رائے پیش کردیتا ہوں۔ یہ دشمنی نہیں ہے۔اگر اس سے کسی کی پول کھلتی ہے یا امامت میں فرق پڑتا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔

اکرم نقاش : مظہر امام صاحب نے مزید یہ لکھا ہے کہ گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فارقی کے اختلافات کا خصوصاً نئی نسل پر کافی منفی اثر ہوا ہے۔ادبی مسائل پر کھل کر لکھنا دشوار ہورہا ہے اور آزادئ اظہار پر ایک قدغن لگ گئی ہے۔ یہ اندیشے کہاں تک درست ہیں؟

گوپی چند نارنگ : یہ بھی رواروی میں کہا ہوا جملہ ہے۔کوئی دونوں ہاتھوں میں لڈو رکھنا چاہتا ہے تو یہ اس کا مسئلہ ہے، ادب میں ذات نہیں قدر دیکھی جاتی ہے۔ جب ترقی پسندوں اور جدیدیت کے نظریاتی اختلافات سے نئے لکھنے والوں کے لیے کوئی الجھن پیدا نہیں ہوئی یا جب آل احمد سرور وعسکری کی راہ الگ تھی اور احتشام حسین وسردار جعفری کی راہ الگ، نیز جب شمس الرحمٰن فاروقی باقاعدہ لتے لے رہے تھے یا عمیق حنفی احتشام حسین کے منہ آرہے تھے، تب تو کسی کی طبعیت مکدر نہیں ہوئی، اب مصلحت پسندی کیوں؟ مسئلہ یہ ہے کہ وہی لوگ جو پہلے آزادئ اظہار کے نام پر اختلاف کے حق پر اصرار کرتے تھے، اب جو ان سے اختلاف کیا گیا تو وہ دوسروں کو یہ حق دینے کو تیار نہیں ہیں اور بدلے میں کنفیوژن پھیلاتے ہیں۔ آزادئ اظہار پر قدغن کس نے لگائی ہے جانتے مظہر امام بھی ہیں۔

نظریاتی اختلاف کو شخصی کون بناتا ہے؟ ہر شخص کو معلوم ہے کہ انتہا پسندانہ اور آمرانہ گفتگو ادب میں گم رہی کو راہ دیتی ہے۔ جاننے کی ضرورت ہے کہ اداعائیت، مبالغہ آمیزی، انتہا پسندی اور خود پسندی کس کا مزاج ہے؟ یہ بھی سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ عمداً نظریاتی سطح پر انتشار پھیلایا گیا اور کنفیوژن پیدا کیا گیا۔ وہی لوگ جو کہانی میں کہانی پن اور کردار نگاری کے خلاف تھے اور تاریخ، تہذیب اور سماج سے جڑی ہوئی اقدار کو، ٹاٹ باہر، قرار دیتے تھے آج وہی تاریخی و تہذیبی بیانیہ لکھ رہے ہیں۔ وہی لوگ جو سیاسی و سماجی قدر کو غیر ادبی قدر کہتے تھے آج پوسٹ کالونیل ڈسکورس کی بات کرتے ہیں۔ بیس پچیس برس پہلے جنہوں نے مشرقی تہذیب یا مشرقی شعریات جیسا کوئی تصور تنقیدی اساس کے بہ طور استعمال نہیں کیا تھا آج وہ مشرقی شعریات کی بات کرتے ہیں۔ کیا یہ سب paradigm shift مابعد جدیدت اور نئے فلسفوں کے بعد نہیں ہوا؟ گویا اعتراض بھی کرنا اور انھیں باتوں کو قبول بھی کرنا۔ یہ ہے تضاد بیانی اور کنفیوژن۔ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وقت کے ساتھ بدلنا بھی چاہتے ہیں اور قبولنا بھی نہیں چاہتے۔ اس لیے کہ دل میں چور ہے۔ حق بات کہنا نہیں چاہتے۔ اقبال نے کہا تھا، خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن۔ یہ ادبی مجاور ہیں خدا رحم کرے ان کے حق میں دعا کی ضرورت ہے۔

اکرم نقاش : مظہر امام صاحب کے مذکورہ بیان کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں تو آج ادبی رسائل دو مخالف محاذوں پر نظر آتے ہیں، ایک طرف 'نیا ورق' ہے تو دوسری طرف 'اثبات'، کہیں 'ادب ساز' تو کہیں 'نئی دنیا'، آج ادبی فضا ایسی ہی صورت حال کی زد پر ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ قلم کار آزادانہ فضا میں کھل کر سانس لے سکیں، اور تناؤ کی فضا معتدل ہو جائے ختم ہو جائے؟

گوپی چند نارنگ : ادب میں اختلافات ہمیشہ رہے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ خرابی وہاں ہوتی ہے جب لوگ نظریاتی یا فکری طور پر اپنے تصورات کا دفاع نہیں کر سکتے تو اوچھے ہتھیار اپنانے لگتے ہیں۔ یہ گندگی پہلے نہیں تھی۔ واضح رہے کہ گالی کم زور فریق کا ہتھیار ہے۔ جب

دلیل کو دلیل سے نہیں کاٹا جا سکتا تو لوگ مغلظات بکنے لگتے ہیں، یا در پردہ فرقہ، برادری، مسلک کا سہارا لے کر اپنے احساس کم تری کو سہلاتے ہیں۔ اختلافات کو برداشت کرنا اور اپنی راہ کھوٹی نہ کرنا بڑ پن اور عالی ظرفی کی دلیل ہے۔ میری شدید خواہش ہے کاش ایسا ہو لیکن ظرف چھوٹے ہو گئے ہیں اور شخصیتیں کوتاہ۔

اکرم نقاش : بڑی شخصیتیں متنازعہ بھی ہوتی ہیں، کیا آپ اس مفروضے سے خود کو مستثنیٰ سمجھتے ہیں؟ حال ہی میں آپ کی کتاب 'ساختیات' پس ساختیات اور مشرقی شعریات، کے بارے میں کچھ منفی تحریریں منظر عام پر آئی ہیں، کیا ان تحریروں کا جواب خاموشی ہی ہو سکتی ہے؟

گوپی چند نارنگ : آپ نے وہ مثل تو سنی ہوگی 'جواب جاہلاں باشد خموشی' کتاب کے ابواب کو چھپے ہوئے آج چوبیس پچیس برس ہو گئے۔ آپ نے میری کتاب پڑھی ہوگی، اگر پڑھی ہے تو اس کا دیباچہ بھی دیکھا ہوگا، انتساب بھی دیکھا ہوگا، جملہ کتابیات کی فہرستیں بھی دیکھی ہوں گی۔ تعجب ہے کہ بات واوین اور قوسین کی کی جا رہی ہے، کتاب کے مباحث ان کی عمدگی یا کمی کی نہیں۔ اگر کوئی بات بر بنائے خلوص کہی جائے تو اس پر غور کرنا فرض ہے لیکن جب معلوم ہو کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ بر بنائے سازش ہے، یا کردار کشی و خوردہ گیری کی مہم کا حصہ ہے تو اس کے بارے میں وہی کہا جا سکتا ہے جو میں نے اوپر کہا ہے۔ پھر باتیں ان لوگوں کی طرف سے اٹھوائی جائیں جن کا تھیوری سے دور دور تک کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ بات سچ ہو تو ایک بار کہنا کافی ہے البتہ جھوٹ کے لیے بار بار کہنا ضروری ہے۔ یہاں تو کھلی افترا پردازی اور کردار کشی ہے۔ بمبئی کے ایک کرم فرما نے جو کچھ لکھا تھا ان کا مسئلہ ذاتی تھا جو سب کو معلوم ہے اور جسے میں دہرانا نہیں چاہتا۔ ان لوگوں کا مسئلہ بھی علمی نہیں ذاتی ہے۔ پھر بھی تین برس پہلے جب نند کشور وکرم اپنی کتاب چھاپ رہے تھے تو ان کے پوچھنے پر میں نے صاف صاف کہا تھا کہ اور یہ چھپا ہوا موجود ہے:

> ''جب میں نے تھیوری پر کام کرنا شروع کیا چوں کہ میری تربیت ساختیاتی لسانیات کی ہے، مجھے احساس تھا کہ فلسفے میں بنیادی ضرورت سائنسی معروضیت کی ہوتی ہے، میرے سامنے

ایسے نمونے تھے جہاں لوگ بات تو فلسفے کی کرتے ہیں لیکن جلد تخئیل کے پروں سے اڑنے لگتے ہیں۔ بہت سے اصل متن سے زیادہ خودکو نمایاں کرنے میں لگ جاتے ہیں یا پھر اپنے اسلوب کا شکار ہوکر انشائیہ لکھنے لگتے ہیں۔ ایک تو اصطلاحیں نہیں تھیں دوسرے نئے فلسفیوں کا انداز ایسا پیچیدہ، معنی سے لبریز اور گنجلک ہے کہ اُسے سائنسی معروضی صحت کے ساتھ قاری تک منتقل کرنا زبردست مسئلہ ہے۔ اصل متن کی precise ness اور زوروصلابت Rigour بنائے رکھنے کے لیے بے حد ضروری ہے کہ افہام وتفہیم میں ہر ممکن وسیلے سے مدد لی جائے اور فلسفے کے ڈسپلن کی رو سے تخئیل کی رنگ آمیزی سے اور موضوعی خیال بافی سے ممکنہ حد تک بچا جائے۔ میری کتاب کے شروع کے دونوں حصے تشریحی نوعیت کے ہیں۔ مشرقی شعریت کے اختتام والے حصوں کی نوعیت بالکل دوسری ہے۔ نئے فلسفیوں اور ان کے نظریوں اور ان کی بصیرتوں کی افہام وتفہیم میں میں نے اخذ وقبول سے بے دھڑک مدد لی ہے۔ جہاں ضروری تھا وہاں تلخیص اور ترجمہ بھی کیا ہے۔ بات کا زور بنائے رکھنے کے لیے اصل کے Quotations بھی جگہ جگہ دینے پڑے تاکہ فلسفیانہ نکتہ یا بصیرت پوری قوت سے اردو قاری تک منتقل ہو سکے۔ ہر حصے کے ساتھ اس کے جملہ مآخذ اور کتب حوالہ کی فہرست دی ہے۔ (مصادر) اور جن کتابوں سے نسبتاً زیادہ استفادہ کیا ہے یا جن سے زیادہ مدد لی ہے، مآخذ کی فہرست میں ان ناموں پر اسٹار (☆) کا نشان بنادیا ہے۔ واضح رہے کہ خیالات سوسیئر، لیوی سٹراس، رومن جیکب سن، لاکاں، دریدا، بارتھ، فوکو، کرسٹیوا، شکلووسکی، باختن وغیرہ کے ہیں، میرے نہیں۔ اسی لیے کتاب کا انتساب ان سب فلسفیوں اور مفکروں

کے نام ہے جن کے خیالات پر کتاب مشتمل ہے۔اس امر کی وضاحت دیباچہ میں کر دی گئی ہے کہ ''خیالات اور نظریات فلسفیوں کے ہیں افہام وتفہیم اور زبان میری ہے''۔ان فلسفیوں کو سمجھنا اور انھیں اردو میں لے آنا اور اردو میں اس طرح لے آنا کہ دوسرے بھی اس افہام وتفہیم میں شریک ہوسکیں اور جن کو اشتیاق ہو وہ چاہیں تو اصل کتابوں سے بھی رجوع ہوں اور ان بصیرتوں سے آگاہ ہوسکیں، میرے لیے مفکرین کی معروضی افہام وتفہیم بہت بڑا چیلنج تھا۔میں اس سے عہدہ برآ ہو بھی سکا یا نہیں یا اردو میں کسی دوسری کتاب یا کسی دوسرے نے یہ تاریخی ضرورت پوری کی،اس پر مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں''۔

(گوپی چند نارنگ: بین الاقوامی اردو شخصیت، مرتبہ نند کشور وکرم، دہلی 2008،ص145)

ان ساری باتوں کی تفصیل میں نے دیباچے میں دے دی ہے اور سب ماٰخذات کے نام کتابیات میں درج ہیں۔کم وبیش ہر صفحہ فلسفیوں کے اقوال اور ان کے نام سے روشن ہے۔مصادر میں بیسیوں کتابوں پر خاص نشان ہیں جن سے میں نے جی بھر کے فیضان حاصل کیا۔معترضین افکار ونظریات پیدائش سے ساتھ لاتے ہوں گے۔میں نے تو جو کچھ حاصل کیا کتابوں سے حاصل کیا۔ان کے نام بھی دے دیے اور ان کو نشان زد بھی کر دیا۔ ادّعا میرا مزاج نہیں، پھر بھی میں چیلنج کر سکتا ہوں کہ ایک ماخذ یا کسی ایک مصنف کا نام آپ بتادیں جس کا حوالہ میری کتاب میں نہ ہو۔میں نے اوپر کہا ہے کہ میں نے بے دھڑک استفادہ کیا ہے۔ان بے چاروں کو تو لفظ سرقہ کے معنی بھی نہیں معلوم۔ایک لفظ کہیں دیکھ لیا اس کا راگ الاپنے لگے۔میں صاف کہہ چکا ہوں کہ افکار وخیالات نظریہ سازوں اور نقادوں کے ہیں فقط ترسیل میری ہے۔میں نے جی بھر کے افہام وتفہیم بھی کی اور اخذ واستفادہ بھی کیا۔جہاں سے کچھ لے سکتا تھا ڈنکے کی چوٹ پر لیا۔البتہ ان افکار سے موتیوں کی جو مالا بنائی ہے اس میں موتی تو کہاں کہاں کے ہیں مگر وہ مالا میرے ذہن نے میں نے پروئی ہے۔میری کتاب کے شروع کے دونوں سیکشن تشریحی ہیں جس میں

ساختیاتی اور پس ساختیاتی مفکرین اور نظریہ سازوں کے خیالات کو جیسا میں نے سمجھا انھیں غیر ضروری خیال آرائی سے بچا کر حد درجہ معروضی انداز میں اپنے فہم وادراک کے مطابق اپنی زبان میں بیان کر دیا۔ میں نے یہ کب دعویٰ کیا ہے کہ یہ خیالات اوریجنل میرے ہیں۔البتہ جو نظریاتی مرقع بنایا ہے وہ برا بھلا میرے ذہن وشعور نے یعنی میں نے ہی بنایا ہے۔اتنا جانتا ہوں کہ سرقہ ورقہ، چوری وغیرہ یہ سازشی مہم بازی کا حصہ ہے، میری کتاب تو ایک معمولی کتاب ہے، یہ کیڑے ڈال کر اس کی توقیر بڑھاتے ہیں۔خود اس سے بہتر کتاب کیوں نہیں لکھ دیتے، یا ایک نام بتا دیں جس کو میں نے نشان زد نہ کیا ہو؟ میں ایک معمولی مصنف سہی، اتنا جانتا ہوں کہ بڑے مصنف چھوٹی موٹی چوری نہیں بڑا ڈاکہ ڈالتے ہیں۔کالی داس نے بھی ڈاکہ ڈالا تھا،ان کا ہر شاہ کار مہابھارت اور پرانوں سے ماخوذ ہے۔شیکسپیئر نے بھی ڈاکہ ڈالا تھا۔غالب نے بھی بیدل پر ڈاکہ ڈالا تھا ورنہ یاس یگانہ چنگیزی زندگی بھر غالب شکنی کا جوکھم نہ اٹھاتے۔اقبال پر بھی قرۃ العین طاہرہ کا الزام عائد کیا گیا۔میں نے تو اپنے دیباچہ میں قاری کو اصل ماخذ سے رجوع ہونے کو بھی کہا ہے اور میری کتاب سے آگے نکل جانے کی دعوت بھی دی ہے۔ مجھے اپنی کوتاہیوں کا احساس ہے۔ مجھے خوشی ہوگی اور ایک دن ایسا آئے گا جب معترضین میں سے کوئی ذاتیات سے ہٹ کر دل سوزی، خلوص اور نیک نیتی سے ایسا کام کرے کہ میرا کام رد ہو جائے۔ خدا کرے ایسا ہو۔کچھ تو ایسا ہے کہ خود شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا تھا کہ ''......ادھر تنقید کی سطح پر ایک زبردست وقوعہ ظہور پذیر ہوا ہے وہ گوپی چند نارنگ کی کتاب ہے، یہ کتاب دیر تک اور دور تک اردو تنقید کو متاثر کرے گی......'' پھر یہ بھی فرمایا کہ ''...... ایک بین العلومی کتاب ہے جس کی قدر زمانہ کرے گا''۔اگر اس کا دس فیصد بھی سچ ہے تو یہ مجھ ناچیز پر ان کا کرم ہے۔اکرم نقاش صاحب، کیوں ادھر آپ نے سب کچھ نہیں پڑھا، میں چاہوں گا کہ آپ ڈاکٹر مولا بخش کی کتاب 'جدید تھیوری اور گوپی چند نارنگ، کا آخری باب ''معترضین نارنگ پر ایک نظر'' جو چالیس پچاس صفحات پر مشتمل ہے، اسے ضرور ملاحظہ فرمالیں اور ذیل کے دو مضامین بھی جو اس کے بعد جوانہوں نے لکھے ہیں، ان کو بھی دیکھ لیں ہر باب کا جواب مل جائے گا:

"Charge of Plagiarisms: Myth or Reality?",

www.outlookindia.com

'The Courtiers and Clowns", www.outlookindia.com

پھر یہ بھی معلوم کر لیں کہ یہ لوگ کتنے اصلی ہیں اور کتنے جعلی؟ ایک جان کارنے تو ان کے بارے میں لکھا ہے کہ جعلی ویزا پر برسوں ہندوستان میں رہے، اسے بار بار بڑھوا کر میزبان ملک کی مہربانی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے رہے، پھر اچانک ایک رات چوری چھپے غائب ہو گئے۔ باہر کے ملکوں میں پہنچ کر تو ہر ادیب بڑا ادیب بن جاتا ہے۔ پورا ریکارڈ RTI میں موجود ہے۔ اگر غلط ہے تو براہ کرم بتا دیں کہ سچ کیا ہے؟ ایسوں کا ساتھ دینے والے بھی ایسے۔ میں تو نہیں کہتا مگر لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ چوری کا گواہ گرہ کٹ، اگر یہ لوگ جعلی نہیں یا ان کا کردار مخدوش نہیں تو بتا دیں کہ پھر اصلیت کیا ہے؟؟؟؟

اکرم نقاش : آج جب انسان چاند پر کمندیں ڈال رہا ہے، ساری دنیا سائنس اور ٹکنالوجی کے غلبے میں ہے۔ ایسے میں کچھ دیوانوں کے جنون کے سہارے زبان و ادب بالخصوص اردو کی نیا کنارے تک پہنچ سکتی ہے؟

گوپی چند نارنگ : اردو کے مسائل تاریخ اور سیاست نے تو پیدا کیے ہی ہیں خود ہم نے بھی پیدا کیے ہیں، جس کا اشارہ اوپر کیا گیا ہے۔ بے شک سائنس اور ٹکنالوجی کے غلبے سے دنیا کی رفتار بدل رہی ہے، سماج بدل رہا ہے، انسان بدل رہا ہے، زندگی بدل رہی ہے، زبانیں بدل رہی ہیں تو اردو میں بھی تبدیلیاں آئیں گی۔ افسوس کہ ہماری زبان بحران کی زد میں ہے۔ یہ بحران سیاسی بھی ہے لسانی بھی اور تہذیبی بھی۔ ادب بیشک جنون کا کھیل ہے، آنے والے زمانے کو نئے پریم چند، نئے منٹو، نئے بیدی، نئے فیض، نئے فراق اور نئے اختر الایمان کی ضرورت ہے تاکہ نئے آفاق روشن ہو سکیں۔ ادب کی پہچان تخلیقیت سے ہے تنقید سے نہیں۔

اکرم نقاش : نئے لکھنے والوں میں ایسے کچھ نام ہیں جن سے آپ کو اُمیدیں ہیں؟

گوپی چند نارنگ : بے شک کچھ نام ایسے ہیں جن سے امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں لیکن ادب

سودوسو میٹر کی دوڑ نہیں یہ لمبے فاصلے کی میرا تھان ہے جس میں اپنی آواز پانے اور انفرادیت کو منوانے میں خاصا وقت لگتا ہے۔ اپنی کتابوں اور تحریروں میں میں نے نام بھی لیتا رہا ہوں اور لکھتا بھی رہا ہوں۔ البتہ نئی پیڑھی میں ریاضت اور علمی ذوق کی کمی ہے، وہ بہت جلد بہکاوے میں آجاتی ہے، تاہم وقت کا سینہ امید سے دھڑک رہا ہے۔ بعض معاصر نقادوں کی طرح میں نئی نسل سے یکسر مایوس نہیں ہوں۔ ●●

(مطبوعہ اذکار جولائی، اگست، ستمبر 2010)

(مطبوعہ ''غزل کار ہندی، دہلی 2016)

(مشمولہ گوپی چند نارنگ کے انٹرویوز کا مجموعہ ''دیکھنا تقریر کی لذت'' 2010)

وارث علوی

نام : وارث علوی

پیدائش : 1928ء احمد آباد(گجرات)

وفات : 9/جنوری 2014ء

تصانیف : 1) حالی مقدمہ اور ہم 1983ء

2) منٹو ایک مطالعہ 1997ء

3) فکشن کی تنقید اور اس کے مسائل 1992ء

4) جدید افسانہ اور اس کے مسائل 1990ء

5) خندہ ہائے بیجا 1987

6) لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر 2001ء

7) پیشہ تو سپہ گری کا بھلا 1990ء

8) بورژوا ژی بورژوا رژی 1999ء

9) غزل کا محبوب اور دوسرے مضامین 2012ء

10) تیسرے درجے کا مسافر 1981ء

11) اے پیارے لوگو 1981ء

12) راجندر سنگھ بیدی (مونوگراف) 1989ء

13) راجندر سنگھ بیدی ایک مطالعہ 2006ء

14) کچھ بچالایا ہوں 1990ء

15) سعادت حسن منٹو (مونوگراف) 1995ء

16) اوراقِ پارینہ 1998ء

17) ادب کا غیر اہم آدمی 2000ء

18) ناخن کا قرض 2001ء

19) سرزنشِ خار 2005ء

20) گنجفہ بازِ خیال 2007ء

21) بت خانۂ چین 2012ء

انعامات واعزازات: 1) گوروپروسکار گجراتی

2) غالب ایوارڈ

3) بہادرشاہ ظفرایوارڈ

4) فروغِ اُردوادب ایوارڈ،قطر2008ء

صدراُردوساہتیہ اکیڈمی گجرات،دومعیاد کے لیے۔

وارث علوی سے ایک مکالمہ

اکرم نقاش : وہ کیا اسباب تھے کہ آپ نے اپنے لیے تنقید کے میدان کا انتخاب کیا اور وہ بھی فکشن کی تنقید کا جب کہ لوگ عموماً شاعری کی تنقید کی طرف مائل نظر آتے ہیں؟

وارث علوی : مجھے بچپن سے کہانیاں سننے اور پڑھنے کا بہت شوق رہا۔ عمر کی اس منزل میں جب کہ میں گجراتی پڑھ سکتا تھا اور اردو پر عبور نہیں تھا، میں نے فٹ پاتھ پر لگی دکانوں سے قصہ حاتم طائی، مع تصویروں کے بہ زبان اردو لیکن رسم الخط گجراتی خریدا، اور حسن آراؤں پریوں اور طلسمات کی دنیا میں پہنچ گیا۔ جب اسکول میں انگریزی پڑھتا (تو ہمارے یہاں) ہر ہفتے ندی کے کنارے جو بازار لگتا جسے گجری کہا جاتا ہے میں اس بازار سے انگریزی فکشن کی جو کتابیں مہیا ہوتیں انھیں خرید لاتا۔ شہر کی لائبریری کا ممبر بنا، اور چیخوف کی کہانیاں جن کا پورا سیٹ لائبریری میں تھا پڑھنے کے لیے لاتا۔ مقصد انگریزی زبان پر قابو پانا تھا۔ کہانی پڑھنا اور اس میں جتنے مشکل الفاظ ہوتے ان کے معانی ڈکشنری میں دیکھتا اور الگ کاغذ پر لکھ لیتا روز میں انھیں ازبر کرتا۔ بس یوں سمجھیے کہ انگریزی سیکھنے کا شوق تھا اور اس کا ذریعہ بنا فکشن، شاعری کا شوق بعد میں پیدا ہوا اور شاعری کی تنقید تو میں سمجھ ہی نہیں پاتا۔ یہ زمانہ میرے پندرہ برس کی عمر کا تھا بعد میں انگریزی کہانیاں اور ناول سمجھنے کے لیے میں ان پر لکھی گئی تنقیدیں بھی پڑھتا، فکشن کی تنقید کا شعور مجھ میں اس وقت پیدا ہوا جب کالج کے زمانے میں اور اس کے بعد برسوں روسی فرانسیسی، انگریزی اور امریکی ناولوں کا ناقدانہ مطالعہ کیا۔

اکرم نقاش : محمد حسن عسکری، آل احمد سرور، نیاز فتح پوری، وزیر آغا اور دیگر بہت سے معتبر نقادوں نے

اورادھر شمس الرحمٰن فاروقی اور فضیل جعفری اور بہت سے نقادوں نے تنقید کے ساتھ تخلیقی کارگزاریوں جیسے شاعری اور فکشن سے بھی سروکار رکھا۔ آپ کا میدان فکشن کی تنقید ہے، فکشن کی مبادیات، زبان و بیان، اس کے حسن و قبح کی تعبیر و تشریح کے دوران آپ کو کبھی یہ خیال گذرا کہ آپ کو فکشن لکھنا چاہیے؟

وارث علوی : نہیں۔ مجھ میں افسانہ لکھنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی۔ صلاحیتوں کو میں خدا کی دین بھی سمجھتا ہوں اور اکتسابی بھی۔ خدا نے مجھے یہ صلاحیت نہیں دی اور اکتسابی طور پر حاصل کرنے کا جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ مجھ میں جو کچھ بھی تخلیقی صلاحیت تھی اس کا اظہار گجراتی زبان میں ڈرامے لکھنے میں ہوا۔ ایک ایکٹ کے پندرہ ڈرامے اور تین ایکٹ کے دو ڈرامے لکھے۔ ان ڈراموں کو میں ہی ڈائرکٹ کرتا تھا۔ مجھ میں جو خداداد حسِ مزاح تھی اس کا بھرپور اظہار ان ڈراموں میں ہوا۔ یہ تھے تو ایک ایکٹ کے ڈرامے لیکن میرے مضامین ہی کی طرح وہ پھیل کر ڈیڑھ دو گھنٹے کے ہو جاتے۔ گجراتی میں ڈرامے اس لیے لکھے کہ اردو میں مسلم کرداروں اور مڈل کلاس مسلم خاندان پر میں جب بھی لکھنے کی کوشش کرتا تو عام اردو ڈراموں جیسے ہی بن جاتے اور مقالوں میں ظرافت کا عنصر پیدا نہ ہوتا میرے ان تمام ڈراموں میں گجراتی مڈل کلاس گجراتی سیٹھ اور نمائندہ گجراتن کے کردار ہیں۔

اکرم نقاش : ہر صنف کی اپنی زبان ہوتی ہے، اس کے تقاضے ہوتے ہیں۔ عموماً آپ کی تنقیدی زبان مروجہ و مستعملہ تنقیدی زبان کے مزاج و منہاج سے خاصی مختلف نظر آتی ہے، اپنے مدعا کے استدلال و تشریح میں جو مثالیں آپ پیش کرتے ہیں وہ طنز استہزا اور جارحیت سے مملو ہوتی ہیں، جس کی مثال کسی اور نقاد کے ہاں نظر نہیں آتی۔ یہ انحراف شعوری ہے یا جو کچھ اطراف لکھا جا رہا ہے اس سے آپ کی فکری عدم آہنگی و عدم اطمینان کا اظہار ہے؟

وارث علوی : تنقید میں میرے اطراف جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ اچھی تنقید کا نمونہ تھا۔ لیکن نظریاتی فکری اختلاف کے پہلو تو تمام نقادوں میں مل جاتے ہیں۔ آپ نے جو یہ کہا کہ اس کی مثال کسی اور نقاد کے یہاں نظر نہیں آتی تو آپ نے خود ہی مجھے بے مثال نقاد بنا دیا۔ بے

شک Style is the man اور قدرت کی مہربانی سے میں تنقید میں ایسا اسلوب پیدا کرسکا جو اختلافات اور اعتراضات میں طنز و مزاح کا کام دیتا ہے اور شاعری اور افسانے کے ان مقامات کا ذکر کرتے ہوئے جو وجدانی کیفیت رکھتے ہیں یہ اسلوب تخیل کا پر لگا کر قاری کو بھی اس تجربے میں شریک کرتا ہے جو اعلیٰ ادب پارے کے تجربے میں پنہاں ہوتا ہے اگر میرا اسلوب دوسرے نقادوں کے اصطلاحات اور اظہار کے بنے بنائے بوسیدہ اور کسیلے اسلوب سے مختلف ہے تو یہ میرا امتیازی وصف ہے۔ اگر میں تنقید میں ایسا اسلوب پیدا کرسکا ہوں جو مشکل پسند گھسی پٹی اصطلاحات سے بھرا ہوا ہوتا ہے اور اگر میں نے عام بول چال کی سلیس زبان کو تنقیدی خیالات اور آراء کے لیے استعمال کیا ہے تو تنقید readable بن جاتی ہے تو میں نے گویا شہر کے اس دروازہ کو کھول دیا ہے جس میں جم غفیر داخل ہوسکتا ہے اور تنقید صرف روکھے سوکھے اساتذہ کی معاش کا ذریعہ نہیں رہی۔

اکرم نقاش : سکندر احمد نے اپنی کتاب ''افسانے کے قواعد'' میں آپ کی تنقیدی زبان، آپ کے مضامین میں استدلال کی کمی کی طرف اشارہ کیا ہے اور بہت شدت سے کیا ہے۔ اس بارے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

وارث علوی : سکندر احمد جیسے نوآموز اور نو وارد آدمی جس کی پوری زندگی بیوروکریسی کی میز پر سرکاری کاغذات میں سر کھپاتے گذری اس کے متعلق میں کچھ بھی کہنا نہیں چاہتا۔ جو بھی کوئی نیا آدمی باقر مہدی سے ملنے آتا تھا تو باقر پوچھتا تھا کیا اس نے کتابیں پڑھی ہیں۔ یہی سوال میں سکندر احمد سے کرنا چاہتا ہوں۔

اکرم نقاش : آپ جدید افسانے کی شاعرانہ نثر کے شاکی ہیں آپ لکھتے ہیں کہ ''جدید افسانہ شاعری سے قریب ہونے کی کوشش میں وہ نثر کی پہنائیوں سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ جدید افسانے کا شاعرانہ پن محض ایک فریب ہے اس کی حالت اس نازک اندام نرگسی لونڈے کی سی ہے جو عورت بننے کی خواہش میں مردانہ جسم کی صلابت اور وقار سے محروم ہوگیا اور عورت بھی نہ بن سکا۔'' کیا اس بات کا اطلاق سارے جدید افسانوں پر ہوتا ہے؟ کیا یہ بیان انتہا

پسندانہ نہیں ہے؟

وارث علوی: جی نہیں، یہ بیان انتہا پسندانہ نہیں ہے۔انتہا پسندی تو جدید افسانہ نگاروں سے سرزد ہوئی کہ انھوں نے اس بات کا خیال ہی نہ رکھا کہ افسانہ اگر نثری صنف ہے تو اس میں نثر کا حسن ہونا چاہیے جیسا کہ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، غلام عباس اور ضمیر الدین احمد کے افسانوں میں جھلکتا ہے۔ یہ حسن آپ کو ادب میں شاعری کرنے والے ادب لطیف کے لکھنے والوں جیسا کہ ل۔احمد اکبرآبادی، سجاد حیدر یلدرم اور ان کے دوسرے ہم عصر لکھنے والوں میں ملتا ہے۔فلابیر کی مادام بواری کو جدید فکشن کی پہلی ناول کہا جاتا ہے اس لیے نہیں کہ وہ ایک اخلاق سے بھٹکی ہوئی فضول عورت کی کہانی ہے۔روایتی عورت سے الگ بواری بے شک ایک جدید منفرد کردار ہے۔لیکن ناول کا اسلوب بھی اس قدر شاندار، تصویر ساز اور دنیا کی کھردری حقیقتوں اور کردار کی نفسیاتی کیفیتوں کی بے مثال تصویر گری کرتا ہے۔ ایسا ہی اسلوب مشہور افسانہ نگار موپاساں کے یہاں ملتا ہے اور نئے افسانہ نگاروں کو سمجھدار نقادان دونوں کے اسالیب کا حسن اپنے افسانوں میں پیدا کرنے کی تلقین کرتے۔اردو میں افسانے کی جس زبان کو پریم چند نے پروان چڑھایا اس نے ادب لطیف لکھنے والوں کی زبان کو از کار رفتہ کر دیا۔ پریم چند بہت بڑے افسانہ نگار تھے۔زبان پر قدرت تھی اور نہایت ہی جزرس الفاظ کا استعمال کرتے تھے۔پریم چند کی بھی وہ قدر نہ ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔شاعرانہ زبان کے چٹخاروں پر پلے ہوئے عالموں نے یہ کہہ کر زبان کا مذاق اڑایا کہ ''از زبان بوئے پکوڑی می آید''۔لیکن یہی زبان اردو افسانے کی سکہ بند زبان بننے والی تھی۔کیوں کہ اردو افسانہ اسی راہ پر چلا جو پریم چند کی حقیقت نگاری نے تشکیل دی تھی۔منٹو، بیدی، عصمت چغتائی کرشن چندر، بلونت سنگھ، احمد ندیم قاسمی، غلام عباس کے افسانے پریم چند کے قبیلے کے افسانے ہیں۔میں نے کوئی ایسا جھاڑ و پھیر بیان نہیں دیا تھا کہ جس میں جدید (غیر جدید نئے افسانے) شامل ہوں۔ہاں، جسے جدید افسانہ کہا جاتا ہے وہ پورا کا پورا ادب لطیف کی زبان میں لکھا ہوا ہوتا ہے یعنی شاعرانہ زبان میں لکھا ہوا ہوتا ہے اور تمام افسانہ نگاروں کے افسانے ایک ہی جیسے لگتے ہیں۔کسی زمانے میں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور سریندر پرکاش کے افسانے نیا رنگ اور آہنگ لے کر آئے۔لیکن ان کی زبان شاعرانہ

نہیں۔حقیقت پسندانہ اور علامتی ہے۔ان پر بات کرتے ہوئے ہمیں ہر ایک کی منفرد خصوصیات اجاگر کرنا چاہیے، اور بتانا چاہیے کہ یہ نیا نرالا ہونے کے باوصف روایتی افسانے کی گھنگور گھٹاؤں کے نیچے کیسے پروان چڑھا۔شاعرانہ پن سے تو اچھی شاعری بھی دور رہنا چاہیے۔اسلوب جو خیال کا لباس نہیں ہے اسے لمحہ بھر کے لیے لباس سمجھ لیا جائے تو جامہ زیب آدمی اسی آدمی کو سمجھا جائے خوبصورت لباس جس پر جچتا ہو۔

اکرم نقاش : ''جدید افسانہ اور اس کے مسائل''میں آپ نے جدید افسانے کے متعلق لکھا ہے کہ ہمارا افسانہ انشائیہ بن گیا جس میں زندگی نہیں بلکہ شخصیت پیش ہوتی ہے۔مجھے وہ افسانوی دنیا پسند نہیں جس کا ہر آدمی دانائے راز ہو اور آسمانی مکاشفہ کی زبان میں بات کرتا ہو مزید آپ لکھتے ہیں کہ سب کے سب ایک ہی زبان بولتے ہیں رسالوں میں چھپنے والے تمام افسانے ایک ہی افسانہ نگار کا کارنامہ معلوم ہوتے ہیں۔ان خیالات کی روشنی میں انتظار حسین، انور سجاد، احمد ہمیش، سریندر پرکاش، بلراج مین را اور نیر مسعود کی انفرادیت یقیناً خطرے میں پڑ جائے گی اس بارے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

وارث علوی : اس سوال کا جواب اوپر کہیں آ گیا ہے۔لیکن آپ نے جو چند افسانہ نگاروں کے نام گنوائے کہ ان کی انفرادیت کا کیا ہوگا تو یقین مانیے کہ ان سب کی انفرادیت قائم رہے گی لیکن ان میں سے کچھ لوگ ادب میں کب تک زندہ رہیں گے یہ کہنا مشکل ہے۔انتظار حسین کے متعلق میں اوپر لکھ چکا ہوں، انور سجاد کے متعلق بھی میں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ان کے یہاں تصنع اور بناوٹ زیادہ ہے۔ان کے ناول اور افسانے ایسے نہیں ہیں کہ لوگ دلچسپی سے پڑھیں، ہم نے پڑھے اور ان میں دل چسپی ختم ہوگئی۔ان کی شخصیت میں دکھاوے کا عنصر اس وقت ظاہر ہوا تھا جب انھوں نے پاکستان میں ایٹم بم بنانے پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔شخصیت کا کھوٹ یہاں ظاہر ہوتا ہے۔انور سجاد کے افسانوں کی کم زوری یہ ہے کہ ان میں شعوری کاوش صاف نظر آ جاتی ہے۔علامت ان کے یہاں پھول کی طرح کھلتی نہیں بلکہ تخیل کو ہتھوڑہ بنا کر ٹھونک ٹھونک کر چسپاں کی ہوئی نظر آتی ہے۔محض انفرادیت سے کام نہیں چلتا۔ادب کی تخلیق میں بے شمار باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔احمد ہمیش نے بہت لکھا اور اچھا لکھا لیکن مجھے ان کی کتابیں دست یاب نہیں ہوئیں۔جو دو چار

چیزیں رسالہ شعور میں پڑھی تھیں ان کی بنیاد پر مجھے یاد نہیں کہ میں نے کچھ لکھا یا نہیں لکھا۔ بلراج مین را کا ذکر میں اپنی کتاب میں کر چکا ہوں۔ سریندر پرکاش پر میں نے ایک طویل مضمون لکھا ہے جو میری نئی کتاب ''غزل کا محبوب اور دوسرے مضامین'' میں شامل ہے۔ اسے آپ پڑھیے اور دیکھیے کہ جدید افسانے کی طرف میرا رویہ تعصب کا ہے یا تفہیم و تعریف کا۔

اکرم نقاش : فکشن کی جب بات ہوتی ہے تو منٹو، بیدی، کرشن چندر اور عصمت چغتائی کے نام لازمی طور پر ہر نقاد کے قلم پر ہوتے ہیں بلکہ یہ کہنا بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ ان فکشن نگاروں کی تحریریں اب کلاسک کا درجہ اختیار کر چکی ہیں۔ لیکن نئی نسل سے یا نئے لکھنے والوں سے اسی طرح کی تحریروں کا تقاضہ کرنا کہاں تک درست ہے۔ اگر یہ تقاضہ مناسب ہے تو نیا افسانہ کسے کہا جائے اور نئے لکھنے والوں کی اپنی انفرادیت کیا ٹھہرے گی؟ اس طرح تو ادب میں امکانات کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ تفصیل سے بتائیں؟

وارث علوی : جہاں تک میرا خیال ہے کسی بھی نقاد کی تحریر سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ نئے لکھنے والوں سے بیدی یا منٹو کے طرز کے افسانے لکھنے کا تقاضہ کرتا ہے۔ خواہش صرف یہ ہوتی ہے کہ جو افسانے کا اسٹرکچر ہے وہ قائم رہے۔ کیوں کہ وہ نہیں ہے تو افسانے کی کوئی شناخت بھی نہیں۔ وہ ادب لطیف ہے مکاشفے کا ٹکڑا ہے خود کلامی کا نمونہ ہے خلیل جبران کی نقالی ہے اسٹرکچر کا خیال نہ رکھنے کی وجہ سے جدید افسانے میں وہ تمام برائیاں پیدا ہوئیں جن کا میں نے ذکر کیا۔

اکرم نقاش : یہ بات میں نے نارنگ صاحب سے بھی اپنے انٹرویو میں پوچھی تھی کہ نیر مسعود کے افسانوی فن پر کوئی باقاعدہ تنقیدی مکالمہ سامنے نہیں آیا ہے جب کہ ان سے کم تر درجے کے افسانہ نگاروں پر بڑے بڑے نقادوں نے جی کھول کر بحثیں کی ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے، کیا نیر مسعود بہت پیچیدہ افسانہ نگار ہیں یا غیر اہم افسانہ نگار؟

وارث علوی : نیر مسعود ہمارے عہد کے بہت اہم افسانہ نگار ہیں۔ ان کی زبان اردو افسانوی اسلوب

میں ایک بے حد ذہین حساس اور مصورانہ طاقت رکھتی ہے۔ ان کے کردار ہمارے گردوپیش کے تمام جانے پہچانے لوگ ہیں۔ اس کے باوجود وہ ہر کردار میں ایسی خصوصیات پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ دوسروں سے بالکل الگ اور منفرد نظر آتا ہے۔ نیر مسعود کے افسانوں کی دنیا ہماری ہی دنیا ہے لیکن نیر مسعود نے اس میں ایسے رنگ بھرے ہیں، ایسے نقش و نگار پیدا کیے ہیں، ایسے فکر انگیز واقعات لکھے ہیں اور ایسے کرداروں سے روشناس کرایا ہے جنھیں ہم جانتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے افسانے پیچیدہ تو نہیں ہوتے البتہ ختم ہوتے ہی معنویت کھو دیتے ہیں۔ اس افسانے کے کیا معنی ہیں۔ نیر مسعود کیا بتانا اور کہنا چاہتے ہیں وہ آدمی کی سمجھ میں نہیں آتا حالاں کہ ان کا لکھا ہوا ایک ایک لفظ ہیرے اور موتی کی طرح چمکتا ہے۔ پورا افسانہ ذہن کے سامنے ایسے انوکھے واقعات اور کردار پیش کرتا ہے جنھیں پڑھ کر ہم ششدر رہ جاتے ہیں۔ لیکن یہ واقعات و کردار ہماری ہی دنیا کے لوگ ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنے خوب صورت افسانے کو نیر مسعود نے انجام کو پہنچا کر قاری کے لیے کیوں مبہم رکھا۔ جس افسانے کو اتنے شوق سے پڑھا گیا ہو اور زبان بیان اور کرداروں اور واقعات کے انوکھے اچھوتے پن سے عش عش کیا گیا ہو وہ افسانہ آخر کہنا کیا چاہتا ہے اس کی معنویت کیا ہے۔ اگر ہم جیسے غبی قارئین نیر مسعود کو نہیں سمجھ پاتے تو جو علامتی، تمثیلی افسانوں کے نباض ہیں وہ بھی تو ان کے سامنے لاچار ہیں۔ آپ نے کہا کہ بڑے نقاد کیوں ان پر نہیں لکھتے۔ افسانہ جب سمجھ ہی میں نہ آئے تو ان پر کیا لکھا جائے۔

اکرم نقاش : 80 کے بعد فکشن میں جو نام خاصے توانا اور منفرد نظر آتے ہیں وہ سید محمد اشرف اور خالد جاوید کے نام ہیں۔ ان کے افسانوی کینوس پر رفیق حسین اور احمد ہمیش کے انداز و اسلوب کی پرچھائیاں بھی لوگوں نے تلاش کیں۔ آپ کا خیال اس بارے میں کیا ہے۔ ان کے فن کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

وارث علوی : سید محمد اشرف اور خالد جاوید دونوں باصلاحیت افسانہ نگار ہیں۔ سید محمد اشرف نے تو اپنی تخلیقات کے ذریعہ اردو فکشن کی تاریخ میں اپنی جگہ بنالی۔ لیکن خالد جاوید میرا خیال ہے جب سیدھے چلتے ہیں تو اچھے لگتے ہیں۔ آڑے ٹیڑھے چلتے ہیں تو رپٹ جاتے

ہیں۔ میں ان کی کہانیوں پر مضمون لکھ چکا ہوں۔لیکن میں چاہوں گا کہ میں بتاؤں کہ آپ کے پاس غیر معمولی تخلیقی صلاحیت ہے اس کا استعمال سوچ سمجھ کر کیجیے اور ایسے افسانوں سے اردو کا دامن بھر دیجیے جو انسانی وجود کے اندر رہتے ہوئے غم زندگی کا شعور عطا کرے۔

اکرم نقاش : ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' اور شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے افسانوں کا پچھلے دنوں خوب چرچا رہا۔ فاروقی صاحب کی فکشن نگاری پر آپ کی رائے جاننا چاہوں گا۔ بالخصوص ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کے حوالے سے؟

وارث علوی : فاروقی صاحب کا ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کے مطالعہ کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ فاروقی صاحب میں فکشن کی تخلیق کی خداداد صلاحیت ہے ان کی ناول کی جتنی تعریف ہوئی ہے وہ حق بہ جانب ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ طبیعت کی ناسازی کے سبب ان کے افسانوں اور ناولوں پر کچھ نہ لکھ سکا۔ فاروقی کی فکشن کی نثر میں تخلیقی جوہر ہے۔ میں رائے زنی پر تنقیدی مطالعہ کو اہمیت دیتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ ایک اہم ناول کا ناقدانہ مطالعہ نہیں کر سکا۔ ناقدانہ مطالعہ کے ذریعہ ہی کسی بھی تخلیق کی خوبیاں اور کمزوریاں سامنے آتی ہیں۔ اس لیے میں اس ناول پر خود کو اظہار رائے تک ہی محدود رکھتا ہوں۔ یہ ناول دل چسپ ہے اور بہت سے تاریخی اور تہذیبی عناصر سے ثروت مند ہے۔

اکرم نقاش : اردو تنقید کے عصری منظر نامے پر آپ کی رائے جاننا چاہوں گا؟

وارث علوی : عصری منظر نامے کی ایک نمایاں خامی تو یہ ہے کہ تنقید نگاروں میں مغربی ادب کی واقفیت عنقا ہے اس لیے کسی کے یہاں بھی تنقید میں ژرف نگاری، صنف سخن کی بصیرت اور خوبیوں اور خامیوں کا فکر انگیز بیان نہیں ملتا۔ تنقید کا منظر نامہ بہت حوصلہ شکن ہے۔ نئے لکھنے والوں میں مغربی ادب کے مطالعہ کا ذوق وشوق نہیں رہا۔ شاید اس نسل کی انگریزی ہی بنیادی طور پر کم زور ہے۔ یہ ادب کے لیے اچھا شگون نہیں۔ اردو تنقید کی پوری روایت حالی سے لے کر فاروقی اور نارنگ اور اس خاک سار تک مغربی تنقید سے

خوشہ چینی اور روشنی حاصل کرنے کی رہی ہے آج کے نئے نقادوں میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو اس روایت کی پاسداری کرے۔

اکرم نقاش : تنقید میں کس کس کی تحریریں آپ کو متاثر کرتی ہیں؟

وارث علوی : وہ تحریریں جن میں ادبی شعور ہو ذوق وشوق سے لکھی گئی ہوں، دوسرے علوم سے استفادہ ہوا اور نظم، افسانے، ناول، یا ڈرامے کی خوبیاں نیز کمزوریاں ناقدانہ شعور کے ساتھ بیان کی گئی ہوں۔ وہ مجھے پسند آتی ہیں۔ ایک اور چیز جو تنقید میں مجھے پسند ہے وہ ''چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد'' والا میلان ہے۔ فقرے بازی تنقید کو دلچسپ بناتی ہے۔ لیکن یہ کھیل بہت آسان نہیں اور بہت محتاط طریقہ سے کھیلنا چاہیے۔ تنقید میں عالمانہ صلابت بڑی اہم چیز ہے۔ لیکن یہ صلابت جب کتابی بن جاتی ہے یعنی تنقید دوسری کتابوں سے اخذ کردہ نظریات، خیالات اور اصطلاحات سے بوجھل بن جاتی ہے تو میری پسند خاطر نہیں رہتی۔ اگر تنقید میں کسی نظم، غزل اور افسانے کا تجزیاتی مطالعہ نہیں اور محض قصیدہ خوانی ہے تو وہ مجھے میں دلچسپی پیدا نہیں کرتی۔ تنقید میں پیچیدہ بیانی، اصطلاحات کا بوجھل پن اور کم زور لکھنے والوں کی بے جا مدح سرائی مجھے پسند نہیں۔

اکرم نقاش : پچھلے دنوں حیدرآباد میں منٹو پر ایک سمینار میں اکرام باگ نے منٹو پر اظہار خیال کرتے ہوئے کچھ سوالات قائم کیے۔ اس بات سے قطع نظر کہ فنی سطح پر منٹو ایک مکمل افسانہ نگار ہے لیکن اس کے موضوعات فی زمانہ از کار رفتہ معلوم ہوتے ہیں منٹو کے افسانے آج وہ بصیرت وانبساط نہیں عطا کرتے جو ان افسانوں کے تخلیقی دور میں ان سے مخصوص تھی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر مجھے اردو کے پچیس بہترین افسانوں کے انتخاب کا موقع ملے تو اس فہرست میں منٹو کا ایک بھی افسانہ شامل نہیں ہوگا۔ کیا یہ بیان حقیقت سے قریب ہے؟

وارث علوی : اکرام باگ، آپ جناب خاکسار میں تو انتہا پسندی دیکھ لیتے ہیں لیکن اکرام باگ جیسے نقادوں میں وہ آپ کو نظر نہیں آتی۔ اس قسم کے پیراگراف پر کوئی بھی سمجھ دار نقاد گفتگو کرنا پسند نہیں کرتا اور اس لیے اس سوال کے جواب میں میں بھی خاموشی اختیار کرتا ہوں۔

اکرم نقاش : اردو فکشن کی تنقید کا کوئی تذکرہ کوئی مکالمہ کوئی محاکمہ وارث علوی کے نام کے بغیر ادھورا رہے گا۔ آپ اتنے عرصے سے لکھ رہے ہیں آپ نے اتنا کچھ لکھا اور آپ کی تحریروں کا زمانہ معترف ہے اس سب کے باوجود انعامات و اعزازات کے ایوانوں میں آپ بہت کم نظر آتے ہیں۔ اس کے کیا اسباب ہیں؟ کیا آپ کو کبھی یہ خیال گذرتا ہے کہ آپ بھی Personal Relationing کے قائل ہوتے؟

وارث علوی : یہ احساس اب بہت سے لوگوں کو ہونے لگا ہے کہ اردو ادب نے وارث علوی سے بے اعتنائی برتی جہاں تک انعامات اور اعزازات کا تعلق ہے تو میں نخوت بھرے انداز میں یہ نہیں کہوں گا کہ میری نظر میں ان کی کوئی اہمیت نہیں لیکن ان کی اہمیت کا احساس اسی وقت ہوتا ہے جب وہ مستحق لوگوں کو دیے جاتے ہیں۔ میرے متعلق یہ خیال غلط ہے کہ مجھے اعزازات نہیں ملے۔ غالب ایوارڈ سے لے کے بہادر شاہ ظفر ایوارڈ تک مجھے مختلف علاقائی انعامات سے بھی نوازا گیا ہے میں ان سب نوازشوں کا ممنون ہوں۔ ●●

(مطبوعہ اِثبات 14-15۔ مارچ 2012 بمبئی)

فضیل جعفری

نام : فضیل جعفری

پیدائش : 1936ء الہ آباد

تعلیم : ایم اے(انگریزی)

مصروفیت: لکچرر انگریزی، صحافت مدیر روزنامہ انقلاب ممبئی، مدیر ہفتہ وار بلٹز

تصانیف : 1) رنگِ شکستہ (شاعری) 1980ء

2) افسوس حاصل کا (شاعری) 2009ء

3) کمان اور زخم (تنقید) 1986ء

4) چٹان اور پانی (تنقید) 1975ء

5) صحرا میں لفظ (تنقید) 1984

6) آبشار اور آتش فشاں

انعامات واعزازات: 1) فخرالدین علی احمد ایوارڈ

2) غالب ایوارڈ 2005ء

فضیل جعفری سے ایک مکالمہ

اکرم نقاش : آپ شاعر، نقاد اور ادیب ہیں اور صحافت بھی آپ کا میدان ہے۔ کسی ادیب صحافی کے لئے یہ مرحلہ کس قدر دشوار ہوتا ہے کہ وہ ادبی تحریر سپرد قلم کر رہا ہو اور صحافی اس کے روبرو کھڑا ہو جائے۔ اور کوئی کالم تحریر کرتے وقت ادیب اس پر حاوی ہو جائے۔ کبھی آپ ایسی صورت حال سے دوچار ہوئے ہیں؟

فضیل جعفری : یہ سچ ہے کہ میں نے شاعری، تنقید اور صحافت تینوں میدان میں دخل اندازی کی ہے لیکن میں کسی میں بھی کوئی ایسا کارنامہ انجام نہیں دے سکا جس پر فخر کر سکوں۔ ممکن ہے کہ میری تنقید پر کہیں کہیں صحافتی انداز غالب آ گیا ہو۔ کالم تحریر کرتے ہوئے ادیب ہونے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ تحریر عموماً زبان و بیان کی اغلاط سے پاک ہوتی ہے۔ میں نے ادبی کالم نگاری نہیں کی، صرف سیاسی موضوعات پر لکھتا ہوں۔

اکرم نقاش : وہ کون سے عوامل تھے جو آپ کی ادبی و صحافتی سرگرمی کا محرک بنے۔ ان میدانوں میں کن قلم کاروں نے آپ کو متاثر کیا۔ اپنے ہم عصروں میں کس کی تحریریں آپ کی توجہ فوری کھینچتی ہیں؟

فضیل جعفری : محرکات وغیرہ کا چونچلا بڑے ادیبوں کے یہاں ملتا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ ادب سے دل چسپی کا سلسلہ کیسے شروع ہوا اور کیوں ہوا۔ جہاں تک صحافت کا تعلق ہے وہ میری مجبوری تھی۔ 1987 میں کالج سے معطل کر دیئے جانے کے بعد مجھے کسی اور ذریعۂ معاش کی تلاش تھی۔ خوش قسمتی سے مجھے روزنامہ انقلاب (ممبئی) کی ادارت کا موقع مل گیا۔

مجھے پہلے سے کسی اخبار کی ادارت کا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن خدا کے فضل سے میں دو قسطوں تقریباً دس سال انقلاب کا مدیر رہا۔ درمیانی عرصے میں میں نے ہفت روزہ ''بلٹز'' اُردو اور ایک انگریزی ماہ نامے One India One People کو بھی ایڈٹ کیا۔ صحافت کے ذکر پر مجھے ایک دل چسپ واقعہ یاد آ گیا۔ غالباً 1968 کی بات ہے جب ماہ نامہ شب خون کے کسی شمارے میں میرے خلاف ایک مضمون بہ عنوان ''صحافتی تنقید'' شائع ہوا تھا۔ مصنف کا نام علی سعید شیرازی تھا۔ رسالے کے مرتب نے ان کا تعارف کلکتہ کے ایک صحافی کے طور پر کرایا تھا۔ دفتر شب خون سے مجھے اسی وقت اطلاع مل گئی تھی کہ مضمون کلکتہ نہیں علی گڑھ سے آیا تھا۔ میں نے مضمون کا جو جواب لکھا اُسے بھی شب خون نے شائع کیا۔ کافی عرصہ بعد جناب مظہر امام نے کہیں انکشاف کیا کہ متذکرہ مضمون خلیل الرحمٰن اعظمی اور وحید اختر کی مشترکہ مساعی کا نتیجہ تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ان دونوں اہم اور موقر شاعروں کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ میں نے آپ کے پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ میں نے ادبی کالم نگاری نہیں کی لیکن اب یاد آیا کہ 85-1984 سے 1990 تک میں ہر ہفتے بلٹز کے لئے ایک ادبی کالم لکھتا تھا جس کا بیش تر تعلق نئی کتابوں پر مفصل تبصروں سے ہوتا تھا۔ وقتاً فوقتاً ادبی مسائل پر بھی لکھتا تھا۔ میرے پاس اپنے اداریوں اور ادبی نیز سیاسی کالموں کی کوئی فائل نہیں ہے۔ میں خاصا غیر منظّم آدمی ہوں۔

اکرم نقاش : غیر جانب دار خالص ادبی مسائل سے سروکار رکھنے والے رسائل کا آج فقدان ہے۔ ہر نیا رسالہ غیر جانب داری کا دعویدار و علم بردار نظر آتا ہے لیکن اس کے صفحات اُلٹتے جائیے، وہی جانب داری و گروہ بندیوں کا تعفن۔ ایسی صورت میں ادب و ادبی مسائل پر گفتگو کیوں کر ممکن ہے؟

فضیل جعفری : ادبی رسائل کے عمومی کردار کے بارے میں مجھے آپ کے خیال سے پورا اتفاق ہے۔ پچھلے دس پندرہ سال میں جو نئے رسائل سامنے آئے ہیں ان کے مدیر زیادہ پڑھے لکھے ہوتے ہیں اور نہ ان میں کوئی تخلیقی صلاحیت نظر آتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اچھے اچھے لکھنے والے بھی محض ذاتی مفاد کے لئے ان لوگوں کی ایسی تعریف کرتے ہیں جس کے وہ ہرگز مستحق نہیں ہوتے۔ گروہ بندی کا بھی یہی معاملہ ہے۔ آزاد ہندوستان میں ادب کا دائرہ

سال بہ سال سمٹتا جارہا ہے۔ اردو میں فی الوقت Intellectual Prostitutes کی بہتات ہے۔ بے نیازی اور نفس مطمنہ کی عدم موجودگی میں لوگ باگ بہت ہی معمولی فائدہ کے لئے ذہن فروشی پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ اگر آپ اس کی نشان دہی کریں تو الٹا آپ کو احمق سمجھا جاتا تھا یا پھر آپ کی نیت پر شک کیا جاتا ہے۔

اکرم نقاش : معاشرتی ابتری، قدروں کا زوال، معاشی بدحالی، اچھے اوراعلیٰ ادب کی تخلیق کا موجب سمجھے جاتے ہیں، اس بات میں کتنی صداقت ہے۔ آج ہم اپنے اطراف نظر ڈالتے ہیں تو ہمارا دور ہر طرح کے انتشار، اضطراب وابتذال سے پُر نظر آتا ہے۔ کیا آج کا ادب اس پر آشوب دور کا حق ادا کر رہا ہے۔ کیا اس میں اعلیٰ ادب یا اچھے ادب کی نشانیاں موجود بھی ہیں؟

فضیل جعفری : اگر آج معاشی بدحالی، سماجی انتشار اور اقدار کے زوال کے باوجود اعلیٰ تو کیا اچھا ادب بھی تخلیق نہیں ہورہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ لکھنے والوں میں تخلیقی صلاحیت ہی نہیں رہ گئی۔ جب شاعر اور ادیب رسالوں میں چھپ جانے کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیں تو پھر اچھا ادب کیسے پیدا ہوسکتا ہے۔

اکرم نقاش : ترقی پسند تحریک کے آغاز وارتقا کا عرصہ قریب قریب 35,30 سال پر محیط ہے۔ جدیدیت کی عمر بھی لگ بھگ اتنی ہی ہے ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے زیر اثر خلق ہونے والے ادب کا محاسبہ آپ کو کس نتیجہ پر پہنچاتا ہے؟ تفصیل سے بتائیں۔

فضیل جعفری : یہ ایک لمبی بحث ہے۔ ترقی پسندوں کے جو محبوب موضوعات تھے ان سے آپ سب واقف ہیں۔ ادعائیت پسندی اور اسٹالن پرستی نے ترقی پسندوں کو کافی نقصان پہنچایا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ترقی پسندوں نے جو کچھ لکھا وہ سب کوڑا کرکٹ تھا۔ فیض کو تو ہر شخص پسند کرتا ہے۔ دوسرے ترقی پسندوں کے مقابلے میں وہ بہت ہوشیار اور عملی (Pragmatic) آدمی تھے۔ انہوں نے روس کے پیسوں پر عیش تو کیا لیکن اسٹالینی آمریت کے پروپیگنڈے سے اپنی شاعری کو دور رکھا۔ مجھے فیض کے علاوہ جاں نثار اختر

جذبی، مجاز وغیرہ کی کئی غزلیں بہت پسند ہیں۔ سردار جعفری کی کچھ نظمیں مثلاً اودھ کی شام حسیں، تمہاری آنکھیں، پتھر کی دیوار اور نیند وغیرہ اعلیٰ پائے کی تخلیقات ہیں۔ مخدوم محی الدین نے ''سرخ سویرا'' کے بعد والے دور میں بہت سی پائدار نظمیں اور غزلیں کہیں۔ 1970 کے بعد ترقی پسندوں نے اپنے ادبی رویئے میں کافی تبدیلی پیدا کر لی تھی۔ اگر آپ شمس الرحمٰن فاروقی اور دو ایک دوسرے لکھنے والوں کو چھوڑ دیجئے تو حقیقت یہ ہے کہ اہم ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں نے ادب کا جتنا گہرا مطالعہ کیا تھا اُس کا عشر عشیر بھی جدید لکھنے والوں کے حصے میں نہیں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر جدید ادیب اور شاعر بہت جلد تھک گئے۔ لیکن یہ کہنا بھی غلط ہوگا جدیدیت کے زیر اثر لکھنے والوں نے سرے سے ہی کوئی کارنمایاں نہیں کیا۔ جدید شاعروں اور افسانہ نگاروں نے اردو ادب کو بالکل نئے موضوعات سے روشناس کرایا۔ زبان کو بالکل تبدیل کر دیا۔ نئے اسالیب پیدا کئے۔ اسی طرح جدید نقادوں نے تنقید کے معیار کو نئی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ شاعروں اور افسانہ نگاروں کے مقابلے میں جدید نقادوں کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ آگے چل کر شمس الرحمٰن فاروقی نے کلاسیکی ادب کو بھی جی لگا کر پڑھا اور اس کے بارے میں تفصیل سے لکھا۔ یہ سب زندہ رہنے والی تحریریں ہیں۔

اکرم نقاش : بے باک بے لاگ طرز اظہار آپ کی تنقیدی تحریروں کا خاص وصف ہے۔ بالخصوص معاصر نقادوں اور تنقیدی رویوں پر جب آپ قلم اُٹھاتے ہیں تو موضوع کی گرہ کشائی میں آپ کا قلم شدید طنز اور جراحت سے بھی کام لیتا ہے۔ آپ کے ہم عصروں میں وارث علوی کی تنقید بھی اسی اندازِ تحریر کے لئے خاص کشش رکھتی ہے۔ اگر چہ حق گوئی تنقید کا منصب ہے لیکن تنقید طنز و جراحت کو کس حد تک سہار سکتی ہے؟

فضیل جعفری : میں نے جدید نقادوں سے متعلق اپنی کتاب ''کمان اور زخم'' میں (جس کا نام ایڈ منڈ ولسن کے ایک مضمون کے عنوان سے ماخوذ ہے) کافی تفصیل سے لکھا ہے۔ میں اپنی حق گوئی اور بے باکی وغیرہ کے تعلق سے کوئی دعویٰ نہیں کرتا۔ جہاں تک میرے اسلوب تحریر کا معاملہ ہے اگر آپ کو میرے یہاں شدید طنز اور جراحت جیسے عناصر نظر آتے ہیں تو

یہ میرا نہیں قاری کا مسئلہ ہے۔ جب تک آپ اس کو سہار سکتے ہیں سہاریے اُس کے بعد کتاب کو نظر انداز کر دیجئے تا کہ آپ کی صحت مضر اثرات سے محفوظ رہ سکے۔

اکرم نقاش : سلیم احمد نے اپنی شاعری کے بارے میں کبھی کہا تھا کہ میری شاعری میرا کمزور بچہ ہے مگر یہ ہاتھی کا بچہ ہے۔ یہی بات شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی شاعری کے حوالے سے کہی ہے۔ آپ اپنی تنقید کے مقابلے میں اپنی شاعری سے متعلق کیا سوچتے ہیں؟

فضیل جعفری : مجھے معلوم نہیں کہ سلیم احمد اور شمس الرحمٰن فاروقی میں سے کس کی شاعری ہاتھی کا بچہ ہے اور کس کی شاعری ریچھ کا بچہ ہے۔ مجھے سلیم احمد کی غزلیں بہت پسند ہیں۔ ان کی طویل نظم ''مشرق ہار گیا'' بھی اپنے موضوع پر بڑی کامیاب اور متاثر کرنے والی ہے۔ اس کے مقابلے میں وزیر آغا کی طویل نظم ''آدھی صدی کے بعد'' خرگوش کا بچہ معلوم ہوئی۔ عمیق حنفی کی طویل نظم ''سند باد'' اور شفیق فاطمہ شعریٰ کی ''فصیل اورنگ آباد'' بھی معرکتہ الآراء طویل نظمیں ہیں۔ میں نہ تو اپنی تنقید کے بارے میں کچھ سوچتا ہوں اور نہ شاعری کے بارے میں۔

اکرم نقاش : ''رنگِ شکستہ'' کی غزلیں ڈکشن اور لہجے کی سطح پر دو مختلف رنگوں کی حامل نظر آتی ہیں ایک رنگ وہ ہے جس میں شہری زندگی کی بے بسی، سفا کی، بے حسی، بے گانگی اور جنس کا بے باک طنزیہ انداز ملتا ہے۔ دوسرا رنگ غزل کے روایتی موضوعات، لفظیات و تراکیب سے مزین نظر آتا ہے۔ ایک ہی غزل میں روایت پسندی اور اس سے گریز ایک طرح کی دورنگی سے دوچار کرتا ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

فضیل جعفری : میرا شعری مجموعہ ''رنگ شکستہ'' 1980 میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک میں نے اسے پڑھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ میں نے کبھی بھی اپنی کوئی کتاب بہ طورِ اُصول اپنے خرچ پر شائع نہیں کی۔ تیس سال کے طویل انتظار کے بعد اب میرا دوسرا شعری مجموعہ کرناٹک اُردو اکیڈمی شائع کر رہی ہے۔ اب تو میں شاذ و نادر ہی کوئی غزل یعنی تین چار شعر کہہ پاتا ہوں۔ صحافت کا پیشہ تخلیقی قوت کو قتل کر دیتا ہے۔ میں نے علم و ادب کے

معاملے میں اپنی ذات کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ یہ اُن بیمار ذہنوں کا کام ہے جن میں خود اعتمادی کا فقدان ہوتا ہے۔کوئی سنے یا نہ سنے یہ بے چارے اپنا ڈھول بجاتے رہتے ہیں۔ جان برادر میں آپ کو بھی اس بیماری سے دور رہنے کا مشورہ دینا چاہوں گا۔ ویسے ''رنگِ شکستہ'' سے متعلق آپ کا جو تاثر ہے وہ یقیناً صحیح ہوگا۔

اکرم نقاش : 1960 کے بعد زبان اور اسلوب کی سطح پر شاعری کے مزاج میں نمایاں تبدیلی آنی شروع ہوئی، اُس دور کی شاعری میں فارسی، عربی الفاظ و تراکیب سے اجتناب و گریز کا غالب رویہ ملتا ہے۔ کیا شاعری کے لئے زمانے کے مزاج و معیار سے ہم آہنگ الفاظ کا استعمال ضروری ہے۔ شعری زبان کے تشخص سے متعلق آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

فضیل جعفری : 1960 کے بعد شاعری میں اسلوب اور مزاج کی جو تبدیلیاں آئیں وہ ناگزیر تھیں۔ میں اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار اپنے مضامین ''چٹان اور پانی'' اور ''جدید نظم کی زبان'' میں تفصیل سے کر چکا ہوں۔ میرے خیالات آج بھی وہی ہیں انہیں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں تک عربی اور فارسی الفاظ و تراکیب کے استعمال کا سوال ہے جدید شاعروں کی اکثریت ان زبانوں سے واقف ہی نہیں ہے۔ آپ اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کیجئے۔ دوسری زبانوں میں ہونے والی شاعری کو پڑھیئے زبان کے تشخص کا مسئلہ خود بہ خود حل ہو جائے گا۔

اکرم نقاش : ادبی چشمکیں ہمارا قدیم ادبی ورثہ ہیں، ہجوگوئی شاید انہیں مجادلوں کی دین ہے جن سے مخالفین کی آپسی رنجشیں ہی نہیں ان کی فنی مہارتوں کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ آج کل ہجوگوئی نثر کا روپ دھار چکی ہے۔ ساتھ ہی گروہ بندیوں کے فروغ کا موجب بھی بنی ہوئی ہیں۔ پچھلے کچھ برسوں میں ہمارے دور کے دو اہم نقادوں کے اختلافات نے ادبی فضاء پر عجیب کیفیت طاری کر دی ہے۔ اُردو زبان و ادب کی زبوں حالی سے کون واقف نہیں۔ ایسے میں تخلیقی قلم کاروں کا ان گروہ بندیوں کا شکار ہو جانا کیا ادب کے حق میں ہوگا؟ اس کا سیدھا سا جواب نفی میں ہوگا۔ تاہم اس صورت حال کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

فضیل جعفری : جی ہاں ادبی چشمکیں اور گروہ بندیوں کی لعنت اُردو میں یقیناً در آئی ہے۔ ہمارے یہاں قوت برداشت کا فقدان ہے۔کوئی بھی لکھنے والا خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا اپنے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سننا چاہتا۔فوراً مارنے مرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ جب وہ یہ کام تنہا نہیں کر پاتا گروہوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔خالی برتن میں چھوٹے بڑے چمچے ٹھن ٹھنانے لگتے ہیں۔ یہ بھی میرا مسئلہ نہیں ہے۔ میں نے نہ تو کوئی گروہ بنایا ہے اور نہ میں کسی گروہ میں شامل ہوں۔اگر مجھے کسی سے اختلاف یا اتفاق ہوتا ہے تو کبھی کبھار اس کا اظہار کر دیتا ہوں۔آپ نے نام لیئے بغیر دو نقادوں کا ذکر کیا ہے جن کے آپسی اختلافات نے بقول آپ کے ''ادبی فضا پر عجیب کیفیت طاری کردی ہے'' بھائی مجھ پر ایسی کوئی کیفیت طاری نہیں ہوئی۔اس سلسلے میں ایک ضروری وضاحت یہ ہے کہ اُردو تنقید دو قطبی (Bi-Polar) نہیں ہے۔کئی نقادوں نے اپنے اپنے طور پر قابل قدر کام کیا ہے۔فاروقی کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے بہ یک وقت کئی اصناف میں کام کیا ہے۔ جو دوسرے لوگ نہیں کر سکتے۔ میرا یہ موقف غیر جانب دارانہ ہے اور صداقت پر مبنی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ میرا موقف کسی گروہی عصبیت کا نتیجہ نہیں ہے۔

اکرم نقاش : قرۃ العین حیدر اور شمس الرحمٰن فاروقی کے فکشن کے بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہوں گا۔

فضیل جعفری : قرۃ العین حیدر ہمارے دور کی سب سے بڑی ناول نگار اور ناولٹ نگار ہیں۔ان کے فیملی ساگا'' کار جہاں دراز ہے'' (تین جلدیں) کی بھی اُردو میں کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔انہوں نے کئی بے حد کامیاب اور تاثر سے بھر پور سفر نامے بھی لکھے ہیں۔اور بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ترجمے بھی کئے ہیں۔ایسے Genius بار بار پیدا نہیں ہوتے۔فاروقی کے فکشن کا قرۃ العین حیدر کے فکشن سے موازانہ نہایت نامناسب اور احمقانہ فعل ہے۔ البتہ افسانہ نگاری کے باب میں مس حیدر کا نمبر بیدی،منٹو،احمد ندیم قاسمی اور غلام عباس کے بعد آتا ہے۔ ہمارے دور میں انتظار حسین نے بھی کئی نہایت اعلیٰ معیار کے افسانے لکھے ہیں لیکن ان کی شہرت میں پبلک ریلیشنز کا بھی کافی عمل دخل ہے۔قرۃ العین حیدر

پبلک ریلیشنز سے نفرت کرتی تھیں۔

اکرم نقاش : میں نے موازانہ نہیں چاہا تھا۔ خیر۔ ایک آخری سوال۔ کیا اُردو زبان وادب کا مستقبل فارسی و سنسکرت کی موجودہ حیثیت سے قریب تر ہوتا جارہا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اُردو کی اس صورت حال کے ذمہ دار اکثر اُردو والے ہی گردانے جاتے ہیں اور اُردو زبان کے تئیں حکومت کا متعصب رویہ بھی اس کا سبب سمجھا جاتا ہے۔ آپ ادیب ہیں اور صحافی بھی آپ کی نظر میں حقیقتِ حال کیا ہے؟

فضیل جعفری : سنسکرت کا موازانہ فارسی اور اُردو سے نہیں کیا جانا چاہیے۔ فارسی ایک پورے ملک کی زبان ہے۔ ہم لوگ سماجی اور سیاسی وجوہات کی وجہ سے فارسی پڑھنے لگے تھے۔ انہی وجوہات کی بنا پر اب ہم فارسی سے دور ہو گئے ہیں۔ فارسی ایک زندہ زبان ہے۔ آج بھی ہم فارسی زبان وادب سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح اُردو بھی ایک ملک کی قومی زبان ہے ہندوستانی دستور نے بھی جن 22 زبانوں کو قومی زبان کا مرتبہ دیا ہے ان میں اُردو بھی شامل ہے لیکن اُردو کو پہلے تو سرکاری سرپرستی حاصل نہیں ہے اور پھر اُردو والے بھی اپنی زبان سے کافی دور ہو چکے ہیں۔ ہم نے جب لکھنا شروع کیا تھا اس وقت اُردو کی حالت اتنی ابتر نہیں تھی جتنی کہ آج نظر آتی ہے۔ وہ لوگ قابل رشک اور قابل ستائش ہیں جنہیں ہندوستان میں اُردو کا مستقبل تابناک دکھائی دیتا ہے۔ میں اب عمر کی اُس منزل پر ہوں جہاں ہر دوسرے سال چشمے کا نمبر بدل جاتا ہے۔ مجھے خود اپنا مستقبل دکھائی نہیں دیتا۔ اُردو کے مستقبل کو کیا خاک دیکھ پاؤں گا۔ جو کچھ بھی ہے ٹھیک ہے۔ مرضئ مولا از ہمہ اولیٰ! انٹرویو کے لئے بہت بہت شکریہ! طوطی کی آواز کو بھی کبھی کبھار گونجنے کا موقع ملنا چاہیے۔

اکرم نقاش : سوالات اور بھی ہیں اور آپ کے جوابات نے بھی مزید سوالات کی گنجائش پیدا کردی ہے۔ لیکن یہ معاملہ اللہ نے موقع دیا تو پھر سہی۔ آپ کا بے حد شکریہ! ●●

(مطبوعہ اذکار 13۔جنوری 2010، بنگلور)

محمد علوی

نام : محمد علوی

پیدائش : 1927 احمد آباد (گجرات)

تعلیم : احمد آباد، جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی)

مصروفیت: سول کنٹرکٹر

تصانیف : 1) خالی مکان 1963ء

2) آخری دن کی تلاش 1968ء

3) تیسری کتاب 1978ء

4) چوتھا آسمان 1992ء

5) رات ادھر ادھر روشن 1995

انعامات واعزازات: ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ برائے ''چوتھا آسمان'' 1992ء

محمد علوی سے ایک مکالمہ

اکرم نقاش : شروعات ایک عمومی مگر اہم سوال سے کرنا چاہوں گا کہ آپ کی شاعری کی ابتدا کیسے ہوئی اُس کے محرکات کیا تھے؟

محمد علوی : اکرم صاحب! دراصل شاعری تو بہت بعد کی چیز ہے سب سے پہلے ہم لوگوں نے یعنی میں ، وارث علوی، مظہر الحق علوی وغیرہ نے فکشن بہت پڑھا۔ہم لوگوں نے تاریخی ناولوں سے شروعات کی، اوراس کے بعد شفیق الرحمٰن کی کتاب مل گئی تھی وہ پڑھی اور فکشن تمام پڑھ ڈالا۔کرشن چندر، بیدی، عصمت، منٹو، قرۃ العین حیدر یعنی اس وقت جتنا فکشن لکھا جار ہا تھا تمام پڑھ ڈالا۔کہانیاں بھی لکھیں ۔اس وقت خیال بھی نہیں تھا کہ میں شاعری کروں گا۔لیکن ہوا ایسا کہ ترقی پسند تحریک کی انجمن کی شاخ یہاں احمد آباد میں قائم ہوئی۔ ہر ہفتہ اس کی میٹنگیں ہوا کرتی تھیں اس میں کہانیاں ،غزلیں ،نظمیں سبھی پیش ہوتی تھیں۔بمبئی میں ترقی پسند مصنفین کے اجلاس ہوا کرتے تھے ہم اس میں جایا کرتے تھے۔میں وارث وغیرہ،اور ہم یہاں پر انجمن کی طرف سے ہر سال مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے۔ایک مشاعرہ میں سردار جعفری، کیفی، نیاز حیدر، ساحر، مجاز وغیرہ کو بلایا گیا تھا تو ان لوگوں کو دیکھ کر ان کی شاعری کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اس وقت کوئی بھی فکشن کو اہمیت ہی نہیں دے رہا اور شاعری کی اتنی پذیرائی ہورہی ہے۔واہ واہ ہورہی ہے پھر ہمارا بھی جی چاہا کہ شاعری کی جائے تو شروع میں ہم نے ترقی پسندی کے اسٹائل میں یعنی جعفری، کیفی اور ساحر کے اسٹائل میں بے تکی سی کچھ نظمیں کہیں اوران لوگوں کے

ساتھ مشاعروں میں پڑھنے لگے۔اسی درمیان 47ء کی آزادی کا دور شروع ہوا۔ترقی پسند تحریک کی آخری میٹنگ جو بھیونڈی میں منعقد ہوئی تھی اس کے بعد یہ تحریک اس وقت قریب قریب تھم کر رہ گئی تھی اور اس سے لوگ دور ہونے لگے تھے۔ان دنوں حلقۂ اربابِ ذوق کے شاعر تھے تمام پاکستان میں لاہور میں، جن میں شاعری یعنی غزل جو کہتے تھے ان میں عدم، سیف الدین سیف اور باقی صدیقی ان لوگوں کی غزلیں پڑھ کے بہت مزہ آتا تھا۔ بعد میں شاعری پڑھنا شروع کی۔حلقۂ اربابِ ذوق کے تمام شاعروں کو پڑھا۔ پھر 58 کے بعد ایک تبدیلی شروع ہوئی۔میں نے 52 سے 58 تک شاعری چھوڑ رکھی تھی۔ اس کے بعد یہاں احمد آباد میں کچھ دوستوں نے ایک ادبی نشست رکھی اور مجھے خاص طور سے بلایا گیا۔ یہاں عادل منصوری سے ملاقات ہوئی۔دوستی ہوئی اور دوبارہ شاعری کی طرف رجوع ہوئے۔ان دنوں محمود ایاز صاحب بنگلور سے ایک رسالہ نکال رہے تھے۔''سوغات'' وہ اس کا جدید نظم نمبر نکال رہے تھے تو کچھ چیزیں ہم نے بھی ڈرتے ڈرتے سوغات کے جدید نظم نمبر کے لیے بھیج دیں۔ایاز صاحب نے پسند کیں اور جدید نظم نمبر میں شامل کیں اور شاعر کا نام مخفی رکھ کے شہر یار سے ہماری نظموں کا تجزیہ بھی کروایا تو یہاں سے ہماری دوستی شروع ہوئی۔شہر یار سے بھی اور محمود ایاز صاحب سے بھی۔ بہت اچھے تعلقات ہوئے اور سوغات کے ہر شمارے میں میری نظمیں چھپنے لگیں۔اس طرح شاعری کی شروعات ہوئی اور میری نظمیں غزلیں زیادہ تر پاکستان میں نیا دور، سویرا، ادبِ لطیف، سات رنگ وغیرہ میں چھپنے لگیں اور پھر محمود ایاز صاحب نے میری پہلی کتاب ''خالی مکان'' شائع کی اور اس کا پیش لفظ بھی لکھا۔کتاب لوگوں کو پسند آئی لوگوں نے Response دیا۔لوگ اس کو نئی شاعری میں ایک اضافہ سمجھنے لگے۔اس کتاب کی رسمِ اجرا احمد آباد میں ہوئی۔اس وقت ایک مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا تھا۔ایک کتاب تین شاعر کے عنوان سے۔اس میں شہر یار، بمل کرشن اشک اور بشیر بدر کو بلایا گیا تھا۔ان کا یہ پہلا مشاعرہ تھا، مشاعرہ بہت کامیاب رہا اور پھر ایک ایسا دور آیا کہ میں اپنے کاروبار میں لگ گیا اور شاعری سے پانچ سات سال دور ہو گیا۔سوغات بھی بند ہو گیا تھا، اچھے پرچے آ نہیں رہے تھے، پاکستان سے بھی کتابوں کی آمد و رفت بند ہو گئی تھی۔

اکرم نقاش : آپ کے اسلوب کا زمانہ معترف ہے عموماً لہجے اور اسلوب کے قائم ہونے میں عمریں لگ جاتی ہیں۔آپ کا ابتدائی کلام بھی آپ کے منفرد اسلوب کی نشاندہی کرتا ہے،اس اسلوب کے قائم ہونے میں شعور کس حد تک کارفرما ہے؟

محمد علوی : شعوری عمل بالکل اس میں نہیں ہے سب لاشعوری طور پر ہوا۔اس کی وجہ میرے نزدیک شاید یہ ہے کہ ہم نے فکشن بہت پڑھا۔فکشن میں زبان کو برتنے کا جو عمل ہوتا ہے اس کا اثر شاید میری شاعری پر ہوا۔آپ دیکھیں گے کہ میری شاعری میں فارسی کے الفاظ نہیں ملیں گے،رعایتِ لفظی نہیں ملے گی۔میری شاعری کے بارے میں شروع میں تو یہ کہا گیا کہ اس پر منیر نیازی کا اثر ہے۔ویسے مجھے ناصر کاظمی بہت پسند تھے۔منیر نیازی پسند تھے لیکن میں نے ان سے ہٹ کر الگ انداز کی شاعری کی ہے۔تو یقین مانئے کوئی شعوری عمل نہیں اس میں۔بس چلتے پھرتے شعر ہو رہے ہیں۔نظمیں لکھی جا رہی ہیں۔آپ دیکھیں گے کہ جدید شاعری میں نظمیں بہت پلان کے تحت لکھی جاتی رہی ہیں دوسروں کے پاس۔میرے پاس کوئی پلاننگ ہی نہیں ہے۔کوئی موضوع سوجھا نظم ہو گئی۔آپ دیکھئے میں آپ کو بتاؤں کچھ نظمیں میں نے غالب کے شعروں پر کہی ہیں۔ایک نظم ہے:

''ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا''

چاند نے تاروں سے پوچھا
کتنی رات ہوئی بھائی
تارے آنکھیں میچ کے بولے
جاؤ یہاں سے ہرجائی
اتنی دیر سے آتے ہیں
ہم تو اب سو جاتے ہیں
تھوڑی دیر میں دیکھا تو
چاند اکیلا جاتا تھا
چال بہت ہی مدھم تھی

تھوڑا سا لنگڑا تھا

دیکھئے اس میں کوئی وضاحت نہیں کی گئی کہ تاخیر کا سبب کیا تھا۔ تو یہ جو مختصر نظمیں میرے پاس ہیں اس طرز، اس لہجے کی نظمیں پوری اُردو شاعری میں آپ کو نہیں ملیں گی۔

اکرم نقاش : میرے ذہن میں یہ بات آ رہی تھی کہ اس اسٹائل کے بننے میں شعوری عمل بھی کارفرما ہے؟

محمد علوی : آپ دیکھئے اس پوری نظم میں شعوری عمل کہاں ہے۔ کہیں نہیں، سیدھے سادے الفاظ ہیں۔ کوئی اس کے اندر منصوبہ بندی نہیں ہے۔

اکرم نقاش : مروجہ طرز سے بالکل مختلف آپ کا کلام ہے تو میں نے وضاحت چاہی کہ اس میں شعوری عمل کا دخل بھی ہوگا؟

محمد علوی : نہیں بالکل نہیں موڈ ہوا کچھ کہہ دیا ورنہ میں نے منصوبہ بند یا شعوری طور پر اسٹائل کے لیے کوئی کوشش نہیں کی۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شاعری جدید شاعری میں ایک اضافہ ہے۔ آج کل نئی جنریشن آ رہی ہے وہ بھی بہت پسند کر رہی ہے اس انداز کو۔ ہندی کے بہت سے شاعر ہیں وہ میری شاعری کو بہت پسند کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہم نے بہت Light mood میں کیا کوئی شہرت وغیرہ کے چکر کے بغیر۔ شاعری کو ہم نے کبھی پیشہ نہیں سمجھا۔ کسی اعزاز یا ایوارڈ کی توقع بھی نہیں کی۔ عجیب لوگ بیٹھے ہوئے ہیں ایوارڈ کمیٹیوں میں، غالب ایوارڈ ہے اور اکیڈمی ایوارڈ ہے ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ہے یہ سب سفارش کے بغیر ملتے ہی نہیں ہیں اور ایسے انعام کا کیا کیا جائے۔

اکرم نقاش : آپ کی شناخت نظم وغزل دونوں میں مسلّم ہے آپ خود کس صنف سے زیادہ قربت محسوس کرتے ہیں؟

محمد علوی : میرے خیال سے میں دونوں اصناف میرے لیے اتنی ہی پسندیدہ ہیں۔ پورے پچاس سال ہو گئے جدید شاعری کو لیکن جو لکھا جا رہا ہے اس میں اچھی نظمیں آپ ڈھونڈنے

جائیے انگلیوں پر گننا پڑیں گی۔اتنی اچھی شاعری ہوئی نہیں پچاس سال میں۔غزل کا تو ایسا ہے کہ روایتی چیز ہوگئی ہے۔ردیف ہے قافیہ ہے۔قافیہ خود شعر لکھوا دیتا ہے۔میری غزل میں بھی بہت اچھے شعر بے ساختہ ہوئے ہیں اور کچھ غزلیں جو میں نے مسلسل کہی ہیں جیسے جنگل میں ہے، پانی میں یا راستہ وغیرہ یا یہ سب ایک قسم کی مسلسل غزلیں ہیں۔آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ یہ غزلِ مسلسل بھی جدید شاعری میں آپ کو میرے پاس ہی ملے گی۔میں نظم اور غزل دونوں سے یکساں قربت محسوس کرتا ہوں اور موضوع میرے ہاں صنف کا انتخاب خود کرتا ہے۔

اکرم نقاش : ادب میں تجربات کی ضرورت کب پیش آتی ہے، کامیاب تجربہ کسے کہا جائے، اسے جس کے کچھ مقلد ہوں یا اسے جس کا تتبع کوئی نہ کر سکے، کسی مفکر کا قول ہے کہ جب بھی بازار میں کوئی ادبی فیشن مقبول ہونے لگتا ہے تو میں کلاسک کی طرف رجوع کر لیتا ہوں، تاکہ میری ادبی صحت برقرار رہے، اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

محمد علوی : تجربات کے بغیر شاعری ہو یا کوئی اور فن آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔تجربہ پسندی فن کو زندگی بخشتی ہے تجربات ہر میدان میں ضروری ہیں۔میرے خیال میں ترقی پسند تحریک، حلقۂ اربابِ ذوق اس کے بعد جدید شاعری یہ تمام ادوار آتے رہے اور شاعری کی نہج بڑھتی بدلتی رہی۔یہ سب تو ضروری ہے اور اب تو جدید شاعری بھی ختم ہوتی جا رہی ہے اس سے آگے اور نئی چیزیں آئیں گی۔رہی بات کامیاب تجربے کی یا تقلید کی تو کامیاب تجربہ میری نظر میں وہی ہے جس کی اتباع ہو سکے ورنہ وہ تجربہ کس کام کا جس کی تقلید نہ ہو سکے۔

اکرم نقاش : نثری نظم ردوقبول اور تسلیم وارتداد کے مرحلے سے آج بھی دوچار ہے، نثری نظم کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

محمد علوی : نثری نظم تو کوئی چیز ہی نہیں ہے۔وہ نظم ہوتی ہی نہیں۔وہ تو بگڑی ہوئی نثر کا ٹکڑا ہوتا ہے۔اس کی وجہ سے اچھی شاعری پیچھے رہ گئی۔اس کی وجہ سے بہت بگاڑ پیدا ہوا۔ہر

کوئی نثری نظم لکھ رہا ہے۔میں تو اس کو نظم مانتا ہی نہیں ہوں۔نثری نظم کی شاعری،شاعری ہی نہیں ہے۔

اکرم نقاش : لیکن اس پر بہت سے نقادوں نے لکھا بھی ہے کہ اہلِ علم اس کی تائید میں ہیں اور کچھ لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ خیال اہم ہے موضوع اہم ہے۔فنی التزام اتنا اہم نہیں ہے۔

محمد علوی : نثری شاعری کو میں پسند ہی نہیں کرتا کہ موضوع کو لے کر شاعری کی جائے۔موضوع کے پیشِ نظر شاعری کرنے کے لیے اقبال کیا کم تھے۔موضوعاتی شاعری کو میں پسند نہیں کرتا اور میرے خیال میں اس کا کوئی مستقبل بھی نہیں ہے۔آپ دیکھئے آج تک کوئی اچھا شاعر نہیں آیا نثری نظم میں۔نثری نظم کا انتخاب کر کے آپ دیکھ لیں آپ کو چار چھ نظمیں بھی اچھی نہیں ملیں گی۔

اکرم نقاش : احمد ہمیش کی نظموں کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟

محمد علوی : قہقہہ(وہ مجھے بہت چاہتا تھا)احمد ہمیش اچھا شاعر تھا۔وہ حیدرآباد میں جب تھا نثری نظمیں لکھنا شروع کیں اس نے۔شہر یار کا کلیات دیکھا آپ نے کیا کم زور نثری نظمیں کیا کم زور شاعری ہے اس میں۔لیکن ایسی شاعری کو بھی گیان پیٹھ ایوارڈ مل جاتا ہے۔ (قہقہہ)۔

اکرم نقاش : احمد ہمیش کی نظموں کے بارے میں-----

محمد علوی : ہاں وہ بہت پرانی بات ہے اب تو یاد بھی نہیں کہ کیا کہا تھا کیا نہیں کہا تھا۔65-60 کی بات ہے۔

اکرم نقاش : تنہائی اور زندگی کی یک رخی یکسانیت ان موضوعات پر آپ کے ہاں بہت سی نظمیں اور اشعار مل جاتے ہیں،آپ زندگی میں کس طرح کی تبدیلی کے خواہاں ہیں اور تنہائی کے معنی آپ کے نزدیک کیا ہیں؟

محمد علوی : ایک پیریڈ ایسا آتا ہے آدمی کی زندگی میں جب وہ تنہائی شدت سے محسوس کرتا ہے۔ آج کل میں اسی دور سے گزر رہا ہوں۔ حالاں کہ پوری فیملی ہے۔ بیوی ہے بچے ہیں خاندان ہے لیکن اپنے آپ کو اڈجسٹ نہیں کر پا رہے ہیں۔ آدمی بھیڑ میں شامل تو ہوتا ہے لیکن بھیڑ کا حصہ نہیں بن پاتا۔ جب آدمی رشتوں کی، تعلقات کی، زندگی کی بے معنویت پر غور کرنے لگتا ہے اور اس بات کا شعور جب اسے زیادہ ہونے لگتا ہے تب وہ اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کرنے لگتا ہے۔

اکرم نقاش : آپ زندگی میں کس طرح تبدیلی چاہتے ہیں۔ زندگی کی یکسانیت کا ذکر تو آپ کی شاعری میں اکثر ملتا ہے۔

محمد علوی : آپ ایک 85 سال کی عمر کے آدمی سے پوچھ رہے ہیں کہ آپ کس طرح کی تبدیلی چاہتے ہیں (قہقہہ) تبدیلی کے لیے وقت رہا ہی نہیں۔

اکرم نقاش : میرا سوال اس شاعر سے ہے جس کے ہاں یہ موضوع بار بار آیا ہے۔

محمد علوی : کوئی فرق نہیں پڑتا کتنی ہی تبدیلیاں کیوں نہ آئیں زندگی جیسی تھی ویسی ہی رہے گی۔ اسی طرح چلتی رہے گی۔ تنہائی ویسے ہی ساتھ رہے گی میری ایک نظم ہے:

چاند پر جاؤ
یا
تاروں کو چھوآؤ
میں کیا ہوں
یہ سب کیا ہے
یہ سب کیوں ہے
یہ آوازیں
ساتھ ساتھ ہی آئیں گی
آس پاس منڈلائیں گی

دور نہ ہونے پائیں گی۔

اکرم نقاش : محمود ایاز مرحوم نے آپ کے پہلے مجموعے کا پیش لفظ لکھا اور آپ کی نظموں اور اسلوب کی تعریف بھی کی لیکن بعد کے دنوں میں انھوں نے آپ کے ہاں شعری ارتقا کی کمی کی طرف اشارہ کیا۔آپ اس خیال سے کس حد تک متفق ہیں؟

محمد علوی : آپ شاید اس انٹرویو کا ذکر کر رہے ہیں جو خلیل مامون نے محمود ایاز سے لیا تھا تب محمود ایاز نے کہا تھا کہ میرے ہاں ٹھہراؤ آ گیا ہے۔ہوسکتا ہے کہ میرے ہاں ٹھہراؤ آ گیا ہو۔ میں محمود ایاز کی رائے کو بہت اہم مانتا ہوں ہوسکتا ہے کہ ایسا ہو۔لیکن میرا خیال ہے جو کچھ میں نے کہا ہے وہ ایک ہی level سے کہا ہے۔ایک ہی انداز میں کہا ہے۔شروع سے لے کر آج تک ایک ہی معیار سے کہا ہے۔میری شاعری کا معیار و انداز ایسا ہے کہ اس میں مزید وسعت کی یا اُسے اونچا لے جانے کی گنجائش نہیں ہے وہ اپنی جگہ اچھا ہے اور قائم ہے۔محمود ایاز صاحب نے جو کہا تھا وہ ان کی رائے تھی ویسے فاروقی نے میری شاعری پر بہت لکھا ہے۔

اکرم نقاش : نارنگ صاحب نے بھی تو لکھا ہے آپ پر۔۔۔

محمد علوی : (قہقہہ) نارنگ صاحب کا تو ایسا ہے انھوں نے میرے کلیات کا دیباچہ لکھا ہے۔نارنگ صاحب ساختیات جیسے بھاری بھرکم موضوعات پر لکھتے رہے ہیں اور میرا دیباچہ لکھا تو بڑے ہلکے پھلکے انداز میں لکھا۔ان کو یہ انداز بھی آتا ہے۔(قہقہہ) ویسے نارنگ صاحب کی بڑی کرم فرمائی بھی رہی ہے مجھ پر۔اکیڈمی ایوارڈ کے سلسلے میں انھوں نے بڑی معاونت کی۔انھوں نے جیوری ممبرس سے کہا کہ اس کتاب کو ملنا ہے تو ان محترم نے کہا کہ کتاب دیکھنے کے بعد ہی انعام کے بارے میں کچھ کہا جا سکتا ہے،تب میری کتاب منگوائی گئی ۔کتاب پسند کی گئی اور مجھے ایوارڈ ملا۔میں انعام لینے گیا تو انھوں نے مجھے چائے پر بلایا۔مہمان نوازی کی یہ الگ بات ہے لیکن دیباچہ انھوں نے بہت ہلکے انداز میں لکھا۔

اکرم نقاش : ایک عجیب اتفاق ہے کہ جدید شاعری کا اتنا اہم نام جس نے شاعری سے زیادہ فکشن کا مطالعہ کیا ہے یہ بڑی مختلف بات ہے۔ورنہ عموماً شعرا کا فکشن کا مطالعہ بہت کم ہوتا ہے۔

محمد علوی : جی سچ کہا آپ نے۔شعرا عموماً فکشن کا مطالعہ بہت کم کرتے ہیں۔جس کی وجہ سے آپ دیکھیں ان کے مصرعے اتنے زوردار نہیں ہوتے یا ان میں جھول درآتا ہے کہیں یہ لگا دیا کہیں وہ بڑھا دیا، کہیں کچھ زیادہ کر دیا کہیں کچھ کم۔اس کی وجہ میری نظر میں شاید یہ ہے کہ انھوں نے فکشن پڑھا نہیں ہے۔میرے ہاں مصرعے سیدھے سادے حشو وزوائد سے پاک جو ملتے ہیں وہ فکشن کے مطالعے کی دین ہیں ایسا میں سمجھتا ہوں۔

اکرم نقاش : سلیم احمد، ظفر اقبال، محمد علوی اور ان کے فوری بعد عادل منصوری نے غزل کے رسمیاتی اسلوب اور روایتی لفظیات سے شدید انحراف کیا۔لسانی تجربے، بے تکلف لہجہ، سادہ و عام لفظیات ان غزلوں کی پہچان ہے، لیکن ان انحرافی و تجرباتی رویوں کے باطن میں ایک گہرا لسانی شعور، شعری روایت سے باشعور واقفیت بھی صاف نظر آتی ہے۔آپ ان مختلف و متضاد عوامل میں تال میل و توازن پیدا کرنے میں کیوں کر کامیاب ہو سکے؟

محمد علوی : ایسا ہے عادل نے بہت اچھی نظمیں کہی ہیں۔اسلامیات پر بھی لکھا ہے اس نے اور ظفر اقبال کا تو یہ ہے کہ وہ صبح اُٹھ کے پانچ چھ غزلیں کہتے ہیں، ناشتہ کرتے ہوئے (قہقہہ) تو ان کا معاملہ یہ ہے۔کہ وہ کسی بھی چیز کو موضوع بنانے پر قادر ہیں۔تجربہ کے لیے ان کے ہاں یہ رہ گیا ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پر آسانی سے شعر کہہ لیتے ہیں۔

اکرم نقاش : روایت کی پاس داری اور لسانی تجربوں میں آپ نے جو تال میل پیدا کیا اس کے بارے میں بتائیں۔

محمد علوی : وہی بات جو میں نے کہی اپنے سلسلے میں کہ فکشن کا مطالعہ۔اس انفرادیت کی وجہ میرے نزدیک صرف اور صرف فکشن کا مطالعہ ہے۔دیگر شعرا کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔لیکن میری لسانی انفرادیت میں فکشن کا بڑا رول رہا ہے۔فکشن کی زبان میں گھریلو ماحول گھریلو محاورے آس پاس کی چیزیں، روزمرہ کی باتیں یہی سب کچھ میری شاعری

میں ملے گا آپ کو۔

اکرم نقاش : زبان کی تازگی اور عام بول چال کی زبان آپ کے ہاں فکشن کی دین ہے۔کلاسیکل شاعری کے مطالعے کے باوجود آپ کے ہاں عربی فارسی لفظیات کی کمی ایک شعوری عمل لگتا ہے کہ آپ نے کلاسیکل شاعری کا مطالعہ ضرور کیا لیکن اس کے اثرات قبول نہیں کیے۔

محمد علوی : جی ہاں اگر ہم نے کلاسیکل لفظیات کا اثر قبول کیا ہوتا تو ہم بھی مشاعرے کے شاعر ہو جاتے (قہقہہ) دیکھئے مجھے ایک نظم یاد آ رہی ہے اور ایسی نظم وہی کہہ سکتا ہے جس نے فکشن پڑھا ہو۔میری ایک نظم ہے:

گھر کی اک ایک چیز سے نفرت ہے مجھ کو
گھر والے سب کے سب میرے دشمن ہیں
جیل سے ملتی جلتی صورت ہے گھر کی
ابا مجھ سے روز یہی فرماتے ہیں
کب تک میرا خون پسینہ چاٹو گے
اماں بھی ہر روز شکایت کرتی ہیں
کیا یہ جوانی پڑے پڑے ہی کاٹو گے
بھائی کتابوں کو روتا رہتا ہے سدا
بہنیں اپنا جسم چرائے رہتی ہیں
میلے کپڑے تن پر داغ لگاتے ہیں
بھیگی آنکھیں جانے کیا کیا کہتی ہیں
چولھے کو جی بھر کے آگ نہیں ملتی
کپڑوں کو صندوق ترستے رہتے ہیں
کھڑکی اور دروازے مجھ پر ہنستے ہیں
اب میں گھر میں پاؤں نہیں رکھوں گا کبھی
یہی سوچ کے گھر سے باہر جاتا ہوں
سب رستے ہر پھر کے واپس آتے ہیں

روز میں اپنے آپ کو گھر میں پاتاہوں
خون پسینہ ایک کرنا یا جوانی پڑے پڑے کاٹنا شعری زبان نہیں ہے لیکن نظم میں یہ الفاظ موزوں ہوئے ہیں یہ ایک مکمل کہانی ہے واقعہ ہے۔ یہ ساری فکشن کی زبان ہے۔

اکرم نقاش : ندا فاضلی شہریار ظفر اقبال کی شاعری کے بارے میں آپ نے کچھ کہا ہی نہیں؟

محمد علوی : شہریار میرے بہت خاص دوست ہیں ہم دونوں نے شاعری ایک ساتھ شروع کی اور بہت پیار سے ملتے تھے۔ یہاں تک کہ بمبئی میں جب میں بیمار ہوا تب ملنے بھی آئے لیکن ان تینوں میں کم زور بہت کم زور شاعری اگر کسی کی ہے تو وہ شہریار کی ہے۔ اتنی معمولی شاعری ہے کہ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

اکرم نقاش : لیکن بڑے بڑے نقاد ان کی شاعری کو بہت اہم مانتے ہیں گیان پیٹھ ایوارڈ بھی ان کو ملا؟

محمد علوی : وہی تو مجھے تعجب ہوتا ہے نارنگ صاحب نے کیا ہوگا یہ سب کچھ (قہقہہ)۔ اس سے تو بہتر تھا کسی کو معمولی شاعر کو گیان پیٹھ ایوارڈ دے دیا ہوتا۔ ایک ہی بات تھی۔ اس کو ملتا یا شہریار کو۔ یہ ایوارڈ جہاں فراق کو ملتا ہے، سردار جعفری کو ملتا ہے، قرۃ العین حیدر کو ملتا ہے وہاں شہریار کو گیان پیٹھ ایوارڈ کیسے دیا جا سکتا ہے۔ ایوارڈ نارنگ صاحب کی وجہ سے ملا ہوگا۔ ورنہ شاعری کی بات کی جائے تو شہریار کی شاعری بڑی کمزور شاعری ہے۔

اکرم نقاش : اور ندا فاضلی، ظفر اقبال......؟

محمد علوی : ندا فاضلی کے ہاں شاعری ہے لیکن وہ مشاعرے کی شاعری کرنے لگتے ہیں تو بیٹھ جاتے ہیں تو یہ جو ہمارے ظفر اقبال ہیں انھوں نے شروع میں بہت اچھی شاعری کی۔ اب تو ایسا ہے کہ وہ مسلسل لکھتے چلے جاتے ہیں ہر بات ہر موضوع پر۔

اکرم نقاش : لیکن آج کل ظفر اقبال صاحب کے تعلق سے یہ بات مشہور ہو چلی ہے کہ وہ غالب کے

ہم پلہ شاعر ہیں۔فاروقی صاحب کے حوالے سے یہ بات موضوع بحث بنی ہوئی ہے کہ ایسا فاروقی صاحب نے کہا ہے۔

محمد علوی : کیا کہہ رہے ہیں آپ (بے حد تعجب سے) غالب کے ہم پلہ یہ کیا بات کہہ رہے ہیں آپ؟ فاروقی صاحب تو ایسا کچھ کہہ دیتے ہیں کہ جو بحث کا موضوع بن جائے۔انھوں نے فراق کے مقابلے میں احمد مشتاق کو بڑا شاعر کہا تھا۔یہ بات بھی سچ ہے کہ احمد مشتاق بہت اچھے شاعر ہیں بہت عمدہ شاعری کرتے ہیں لیکن کہاں فراق اور کہاں احمد مشتاق؟ اور اسی طرح سے ظفر اقبال والی بات کہ کہاں غالب اور کہاں ظفر اقبال۔غالب کی جوتی کے برابر نہیں ہیں یہ لوگ میرے خیال میں غالب سے بڑا کوئی شاعر پیدا ہوا نہیں ہے اور ہوگا بھی نہیں۔اس نے جو کچھ کہہ دیا ہے وہ میری نظر میں حرفِ آخر ہے۔فاروقی صاحب کی یہ عادت ہے کہ وہ ایسا کچھ کہہ جاتے ہیں جو موضوعِ بحث بنے۔

اکرم نقاش : فاروقی صاحب نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ انھوں نے ظفر اقبال کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں کہی لیکن ظفر اقبال نے یہ سارا قصہ شمیم حنفی صاحب کے حوالے سے فاروقی صاحب سے منسوب کر دیا ہے۔ظفر اقبال کی زود گوئی کھلتی ہے آپ کو، یہ خوبی ہے کہ خامی؟

محمد علوی : بہت بڑی خامی ہے یہ feelings کے بغیر تجربہ کے بغیر شاعری کرنا یہ سب بے کار ہے۔جب تک اندر سے لکھنے کے لیے کوئی چیز مہمیز نہ کرے نہیں لکھنا چاہئے۔زبان پر قابو،فن پر گرفت کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ مسلسل لکھے چلے جا رہے ہیں۔اب تو ان کے ہاں شاعری جیسا کچھ رہا ہی نہیں لیکن ابتدا میں انھوں نے بہت اچھی شاعری کی۔

اکرم نقاش : احمد مشتاق کے بارے میں کیا کہتے ہیں آپ؟

محمد علوی : بہت اچھا شاعر ہے۔بہت اچھی شاعری کی ہے اس نے اور بہت سیدھا سادا آدمی بھی ہے وہ۔بہت اچھا شاعر ہے وہ۔

یہ پانی خامشی سے بہہ رہا ہے
اس کو دیکھیں کہ اس میں ڈوب جائیں

یا

نئے دیوانوں کو دیکھیں تو خوشی ہوتی ہے
ہم بھی ایسے ہی تھے جب آئے تھے ویرانے میں

اور اس میں کوئی پبلی سٹی اسٹنٹ کا چکر بھی نہیں اور نہ اس نے خود کو بڑا یا اہم جتانے کی کبھی کوشش کی۔ بہت اچھا شاعر اور اچھا آدمی ہے احمد مشتاق۔

اکرم نقاش : ظفر اقبال کو پروموٹ کرنے میں فاروقی صاحب کا بہت اہم رول رہا ہے اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

محمد علوی : فاروقی کا تو ایسا ہے کہ کوئی شاعر پسند آ جائے اس کی دو چار چیزیں پسند آ جائیں تو اس کو وہ اچھالتے رہتے ہیں۔ انھوں نے شروع میں مجھے بھی بہت اچھالا تھا (قہقہہ) تو یہ ہوتا رہتا ہے یہ ان کی عادت ہے اس سے فرق کیا پڑ گیا۔ ظفر اقبال کو بہت محدود حلقہ ہی پسند کرتا ہے سب پسند نہیں کرتے ہیں۔

اکرم نقاش : آپ کے ادبی سفر میں اس سے قبل بھی طویل تخلیقی وقفے آئے ہیں ادھر کچھ برسوں سے آپ کی کوئی تخلیق منظر عام پر نہیں آئی، کیا ہم اس تعطل کو تخلیقی وقفہ کہہ سکتے ہیں؟

محمد علوی : اب تو میرے خیال سے کہنے کے لیے کچھ رہا ہی نہیں کچھ جگہ ہی نہیں رہی۔ نہ پڑھ سکتا ہوں نہ لکھ سکتا ہوں۔ کچھ اس طرف طبعیت مائل نہیں ہے۔ اب آخری بار کچھ نظمیں، غزلیں کہی تھیں وہ چھپی تھیں نیا ورق میں۔ آپ نے پانچ سال پہلے دیکھی ہوں گی۔

اکرم نقاش : آپ کے ہاں جو وقفے آتے ہیں چار پانچ سال آپ خاموش ہو جاتے ہیں اور پھر تخلیقی سفر شروع ہوتا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

محمد علوی : اب کا تو میں کہہ نہیں سکتا۔اب شاید کچھ کہہ نہیں پاؤں گا لیکن پچھلے دور میں جو وقفہ آتا تھا اس کے بعد جب میں پھر لکھنے لگتا تھا تو اس میں تھوڑی بہت تازگی اور نیا پن محسوس ہوتا تھا۔ یہ وقفے میرے حق میں بہت اچھے رہے ہیں۔خالی مکان کے بعد 62 کے بعد 63 کے بعد میں چپ ہو گیا تو 67 تک چپ رہا۔شب خون نکلا فاروقی کو چیزیں بھیجیں وہ مجھ سے منگواتے بھی رہے تو پھر لکھنا شروع ہو گیا تو آخری دن کی تلاش چھپ گیا تو پھر وقفہ پانچ سال۔اس کے بعد تیسری کتاب آئی میرے خیال میں اس میں کافی اچھی تخلیقات آئیں۔

اکرم نقاش : زندگی کو آپ جس جی داری اور معروضی انداز سے دیکھتے ہیں،موت بھی آپ کے نزدیک ایک سانحہ نہیں بلکہ واقعہ نظر آتی ہے۔اس سے آپ گھبراتے نہیں بلکہ استقبال کرتے نظر آتے ہیں۔موت کا تصور آپ کے نزدیک کیا ہے؟

محمد علوی : اس کے پیچھے کوئی فلسفہ نہیں ہے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔آپ جو کہہ رہے ہیں یہ Feeling میرے ہاں آٹھ دس سال سے بڑھ گئی ہے اس سے پہلے تو لائف کو خوب Enjoy کیا گھومتے پھرتے رہے،مزے کیے،شراب پی،دلی بمبئی دورے کرتے رہے۔اپنا مکان بنایا کاروں میں گھومے پھرے سب کچھ کیا تو اس وقت تو موت کے تصور جیسا کچھ تھا ہی نہیں۔یہ سب جب ختم ہونے لگتا ہے اکتا گئے ان سب چیزوں سے تو پھر موت کا تصور زیادہ ہونے لگا۔یہ سب enjoy کرنے کے بعد لگنے لگا کہ یہ سب بے معنی ہے۔آگے بالکل ویرانہ سا نظر آنے لگا لائف میں اور اس وجہ سے عمر کے ساتھ موت بھی قریب آتی گئی یہ بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے اس کا end تو موت ہی ہے وہ تو بہت بڑی بات ہے کہ موت کے بعد کیا؟

اکرم نقاش : آپ کی ایک خوب صورت نظم ہے ''جنم دن'' اس موضوع پر۔
محمد علوی : ہاں۔جی ہاں۔
سال میں اک بار آتا ہے

آتے ہی مجھ سے کہتا ہے
کیسے ہو اچھے تو ہو
لاؤ اس بات پہ کیک کھلاؤ
رات کے کھانے میں کیا ہے
اور کہو کیا کیا چلتا ہے
پھر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہتا ہے
پیارے اب میں ایک سال کے بعد آؤں گا
کیک بنا کے رکھنا
ساتھ میں مچھلی بھی کھاؤں گا
اور چلا جاتا ہے
اس سے مل کے تھوڑی دیر مزہ آتا ہے
لیکن میں سوچتا ہوں
خاص مزہ تو تب آئے گا
جب وہ آ کر
مجھ کو ڈھونڈتا رہ جائے گا۔

اکرم نقاش : آپ کے حافظے پر حیرت ہے۔حافظہ غضب کا ہے۔

محمد علوی : ہاں۔نظمیں یاد رہتی ہیں انھیں یاد کر کے دہراتا بھی ہوں اچھا لگتا ہے۔اب نیا کچھ کہہ نہیں سکتا پچھلے سے جی بہلاتا ہوں۔

کوئی شام ایسی بھی آئے
کہ سورج نہ ڈوبے
اور چاند بھی جگمگائے
ستارے ادھر سے اُدھر بھاگتے ہوں
زمیں آسماں جاگتے ہوں

ہوا پاگلوں کی طرح
ڈھونڈتی ہو مجھے اور نہ پائے
کوئی شام ایسی بھی آئے۔

مجھے اپنا ہی نہیں بہت سے لوگوں کا کلام یاد ہے۔غالب مجھے بہت پسند ہے۔پہلے چیزیں یاد نہیں رہتی تھیں۔اب سب کچھ یاد آتا ہے۔غالب کی پانچ چھ شعر کی غزلیں پوری کی پوری یاد ہیں۔

اک عمر میں جو کچھ بیت گیا
اک پل میں سب دیکھا میں نے

اکرم نقاش : کسی تخلیق کو جانچنے کے پیمانے کیا ہونے چاہئیں،شاعری کے حوالے سے بتائیں؟

محمد علوی : میرے خیال میں کامیاب تخلیق وہ ہے جو بے ساختہ آپ پر اثر کرے۔جانچنے کے بہت سے پیمانے ہیں ردیف،قافیہ،زبان،لفظیات اور ان کا استعمال سب کچھ ہے یہ سب کچھ کسی تخلیق میں ہوگا تبھی تو وہ آپ پر اثر انداز ہوگی،آپ اسے پسند کریں گے۔کسی تخلیق کو ٹکڑوں میں جانچنا مناسب نہیں ہوگا۔اچھی چیز مجموعی طور پر اچھی ہوتی ہے۔

اکرم نقاش : آپ کے نزدیک اثر پذیری اہم چیز ہے؟

محمد علوی : اچھی چیز کو جانچنے کی ضرورت ہی نہیں وہ بہ ذاتِ خود اچھی ہوتی ہے اس میں ہر چیز ہوتی ہے۔

اکرم نقاش : ہر تخلیق کار کا تخلیقی عرصہ مختلف ہوتا ہے اس عرصہ کار میں خارجی عوامل کس حد تک کارفرما رہتے ہیں۔ادب میں تحریکات و رجحانات کی کیا اہمیت ہے؟

محمد علوی : یہ سب باتیں فاروقی اور نارنگ بہتر طور پر بتا سکیں گے اس سلسلے میں میں نے کچھ نہیں سوچا۔کبھی غور نہیں کیا۔(قہقہہ)

اکرم نقاش : موجودہ عہد کو میر کی بازیافت کا دور کہا جارہا ہے،فراق،خلیل الرحمٰن اعظمی،ناصر کاظمی،ابنِ انشاءکومیر کی قبیل کےشعرا کہاجاتا ہے۔آپ کےخیال میں فکری ولسانی سطح پر ان میں میر سے زیادہ قریب کون ہیں؟

محمدعلوی : غالب بڑاشاعر ہے میری نظر میں ۔میر کے ہاں اچھے شعر بہت ہیں لیکن غالب کے اشعار کی نکتہ رسی،پیچیدگی،دوراز کار مضامین کی پیکر تراشی یہ سب غالب کا کمال ہے ہوسکتا ہے اس دورکومیر کی بازیافت کا دور کہا جارہا ہےمگر میری نظر میں غالب میر سے بڑاشاعر ہے۔

اکرم نقاش : فاروقی صاحب نے میر کے اشعار کی تفہیم پر چار جلدوں میں تشریح وتفہیم کا کام کیا ہے۔

محمدعلوی : اس سے کیا ہوتا ہے؟ میر بڑاشاعرضرور ہےمگر میری نظر میں غالب بڑاشاعر ہے۔

اکرم نقاش : کلاسیکل شعرااورجدیدشعرامیں آپ کے پسندیدہ شاعر کون ہیں اور کیوں؟

محمدعلوی : غالب سب سے زیادہ ،میر صاحب۔مصحفی ہیں،انشااللہ خاں،داغ،ذوق سے تھوڑی بہت رغبت رہی ہے۔اقبال ان سب سے الگ ہیں وہ شاعر کم اورفلسفی زیادہ ہیں۔وہ بہت بڑی ہستی ہیں لیکن وہ شاعری الگ ہے۔جدید شاعروں میں منیر نیازی،ناصر کاظمی،احمد مشتاق اور کچھ کچھ ظفر اقبال،عادل منصوری پسند ہیں۔ ہندوستان میں کچھ خاص نہیں،کمار پاشی ہیں،ندا فاضلی ہیں،بانی بہت اچھا ہے لیکن مجھے عرفان صدیقی کی چیزیں اتنی پسند نہیں۔ بنابنا کے شعر کہتے ہیں بےساختگی نہیں ہےان کے ہاں جو بانی کے پاس ہے۔سب بھول بھال گئے بانی کو آپ نے یاد رکھا ہے۔کچھ عرصہ بعد سب کے ساتھ یہی ہونا ہے۔

اکرم نقاش : جدیدیت اورشب خون کےرول کے بارے میں آپ کی مفصل رائے جاننا چاہوں گا؟

محمدعلوی : جدیدیت کےفروغ میں شب خون کا بہت اہم رول ہے۔ادب میں چہل پہل رہی۔اس کولوگ پسند کرنے لگے۔بہت بڑا کنٹری بیوشن ہےشب خون کا ادب میں ۔سوغات کا

بھی بہت بڑا رول رہا ہے جدیدیت کے فروغ میں۔

اکرم نقاش : آپ نے فکشن بہت پڑھا۔آپ کے پسندیدہ فکشن نگار کون ہیں؟

محمد علوی : بیدی سب سے زیادہ کامیاب فکشن نگار ہیں اور مس حیدر جو ہیں Ultra modern لائف کو انھوں نے Project کیا۔کرشن چندر نے شاعرانہ زبان میں لکھا وہ بہت پسند کیے جاتے تھے۔ہاں منٹو بہت بڑا نام ہے اس کے موضوعات شگفتہ ہیں۔میری دانست میں فکشن کسی کے ہاں ہے تو شفیق الرحمٰن کے ہاں ہے۔غلام عباس، بلونت سنگھ کی کہانیاں اچھی ہیں احمد ندیم قاسمی دیہی زندگی پر لکھتے ہیں انتظار حسین اور سریندر پرکاش اپنے انداز کے معتبر فکشن نگار ہیں۔باتیں بہت ہوگئیں آپ نے مجھے یاد کیا بہت شکریہ اس یادآوری کا۔اللہ حافظ۔ ●●

(مطبوعہ اذکار 30۔جون 2016، بنگلور)

ندا فاضلی

نام : مقتدا حسن

قلمی نام : ندا فاضلی

پیدائش : 12؍اکتوبر 1938ء، دہلی۔وطن: دیپائی گوالیار

وفات : 8؍فروری 2016ء

تعلیم : ایم اے

مصروفیت: فلمی نغمہ نگاری

تصانیف : 1) لفظوں کا پل (شاعری) 1971ء

2) مورناچ (شاعری) 1978ء

3) آنکھ اور خواب کے درمیان (شاعری) 1984ء

4) سفر میں دھوپ تو ہوگی (شاعری)

5) کھویا ہوا سا کچھ (شاعری) 1984ء

6) دنیا ایک کھلونا ہے (شاعری)

7) ملاقاتیں (خاکے) 1986ء

8) دیواروں کے بیچ (سوانحی ناول)

9) دیواروں کے باہر (سوانحی ناول)

10) چہرے (خاکے) 2002ء

11) دنیا مرے آگے (خاکے) 2009ء

12) شہر تو میرے ساتھ چل 2004ء

13) زندگی کی طرف 2007ء

14) شہر میں گاؤں 2012ء

15) سب کا ہے ماہتاب 2014ء

ہندی، گجراتی اور اُردو میں جملہ 24 تصانیف ہیں۔

انعامات واعزازات: 1) پدم شری ایوارڈ 2003ء

2) ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ برائے ''کھویا ہوا سا کچھ'' 1998ء

3) میر تقی میر ایوارڈ برائے ''دیواروں کے بیچ (مدھیہ پردیش)

ندا فاضلی سے ایک مکالمہ ۱؎

اکرم نقاش : اپنی ابتدائی تعلیم اور خاندانی پس منظر کے بارے میں تفصیل سے بتائیں؟

ندا فاضلی : میری دو کتابیں ہیں، ''دیواروں کے بیچ'' اور ''دیواروں کے باہر'' ان میں تفصیل سے وہ سب کچھ لکھا جا چکا ہے جو آپ کے سوال کا مطالبہ ہے۔ ''دیواروں کے بیچ'' کی شروعات یوں ہوتی ہے۔

''سورج غروب ہو رہا ہے۔ ایک بے ہوش عورت، اردگرد چار پانچ بچے سہمے سہمے، ڈرے ڈرے بیٹھے ہیں۔ بڑی بہن اٹھ کر لالٹین کی چمنی صاف کر کے اسے روشن کرتی ہے۔ چاروں طرف چت کبری روشنی پھیل جاتی ہے۔ گھر کے سامنے املی کے درخت پر ایک ڈراؤنا بھوت روز کی طرح آج بھی آ کر بیٹھ گیا ہے۔ دالان سے آنگن میں آتے ڈر لگتا ہے۔ بڑی بہن بھوت کو دفعہ کرنے کے لیے اندر سے قرآن شریف لا کر باہر اسٹول پر رکھ دیتی ہے۔ بچوں اور بھوت کے درمیان اللہ کے کلام کی حد بن جاتی ہے۔ بھوت میں اس حد کو پھلانگنے کی ہمت نہیں ہے۔ وہ بے ہوش عورت میری ماں ہے، جو دہلی کی رہنے والی ہیں۔ مرتضیٰ حسن دعا ڈبائیوی اس کے شوہر ہیں۔ جو شادی شدہ ہونے کے باوجود ایک مقامی طوائف سے تعلقات قائم کیے ہوئے ہیں۔ دوسری عورت میں ان کی دلچسپی نے میری والدہ جمیل فاطمہ کو اختلاج کے مرض میں مبتلا کر دیا ہے۔ وہ کئی کئی گھنٹے بے ہوش رہنے لگی ہیں۔ ان کے اردگرد بیٹھے ہوئے چار پانچ بچوں میں ایک میں بھی ہوں۔ مقتدا حسن، املی کا درخت جس پر بچپن میں روز بھوت کا ڈیرا ہوتا تھا۔ وہ گوالیار میں کبھی میرے

گھر کے سامنے تھا۔ میرے والد اکثر رات کو دیر سے آتے تھے ان کے قدموں کی چاپ سن کر ہی بھوت وہاں سے جاتا تھا۔ میرے والد کے آنے تک قرآن ہم سب کو بھوت سے بچاتا تھا۔ اس کو اسٹول پر رکھنے والی میری بڑی بہن ہے۔ جو آج کل کراچی میں بیوگی کی زندگی گذار رہی ہیں۔ وہ بے ہوش عورت اب پاکستان کے کسی قبرستان میں ایک قبر بن چکی ہے۔ مرتضیٰ حسن بھی انہیں کے برابر مدفن ہیں۔ میرے والد کا ایک مطلع ہے۔

شان کے لوگ کم رہ گئے
ایک تم ایک ہم رہ گئے

یہ سارے بہن بھائی والدین کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔ میں ان کے ساتھ نہیں گیا۔ اس حادثہ کے بارے میں، میں نے اپنے پہلے شعری مجموعے کے دیباچہ میں لکھا تھا۔

''سن ٦٨ء کی بات ہے۔ رات کا وقت تھا۔ میں بھوپال سے گوالیار آیا تھا۔ میں حسب معمول اٹیچی ہاتھ میں لئے اس برسوں کی جانی پہچانی گلی میں مڑ گیا جہاں املی کی چھاؤں تلے میرا گھر تھا۔ میں نے گلی میں گھستے ہوئے اپنے آپ کو دیکھا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے تک بھی میں اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کے بعد جو واپس لوٹ رہا تھا۔ وہ میں نہیں تھا کوئی اور تھا مجھ جیسا ہی''۔

گھر والے، میری ضد کو غیر ضروری سمجھ کر میرے بغیر ہی سارے بہن بھائیوں کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔ میں ان دنوں گوالیار میں مہارانی لکشمی بائی کالج میں ایم اے آخری سال میں تھا۔ گھر کھو کر گھر کی تلاش میرا مسئلہ تھا۔

گھر کو کھوجیں رات دن گھر سے نکلے پاؤں
وہ رستہ ہی کھو گیا جس رستے تھا گاؤں

اکرم نقاش : شاعری یا لکھنے لکھانے کی ابتداء کیسے ہوئی؟ گوالیار سے دلی تک کا سفر، دلی کے شب و روز اور پھر بمبئی کے دن رات یہاں کی کڑوی میٹھی یادوں کے بارے میں جاننا چاہوں گا۔

ندافاضلی : اچانک گھر سے بے گھر ہونے اور میری شاعری کی ابتداء کی تاریخ کم و بیش ایک ہی ہے۔ حالاں کہ شعر کہنا بہت پہلے شروع کر دیا تھا۔ لیکن شعروں میں خود کی تلاش کی

شروعات یہیں سے ہوتی ہے۔ گوالیار سے دہلی اور دہلی سے دیگر مقامات کے سرد و گرم سے گذرنے کے بعد، ناریل کے بے سایہ درختوں اور کڑوے کھارے پانیوں کے سمندروں سے گھرے ہوئے شہر بمبئی میں آ گیا۔ تب سے یہیں ہوں۔ ممبئی میں میرے شب و روز کا تفصیلی ذکر ''دیواروں کے باہر'' میں شامل ہے۔ اس کتاب کے تعلق سے اقبال رضوی نے بہ طور تبصرہ لکھا ہے۔ ''ندا نے جدوجہد کے دوران ممبئی میں کئی ٹھکانے بدلے۔ ان میں پالی ناکہ کے ایک ہوسٹل میں ایک پلنگ کی رہائش بھی ہے۔ باندرہ گورنمنٹ کالونی میں ایک سرکاری فلیٹ میں ایک کمرہ بھی ہے۔ چیمبور میں غیر قانونی دھندہ کرنے والوں کے ساتھ قیام بھی ہے۔ پانجراپول میں ایک ٹین کی کھولی بھی ہے۔ بار باران بدلتے ٹھکانوں کو ندا نے اپنی غزل کا موضوع بنایا ہے۔

کہیں چھت تھی، دیوار و در تھے کہیں ملا مجھ کو گھر کا پتا دیر سے
دیا تو بہت زندگی نے مجھے مگر جو دیا وہ دیا دیر سے

اس غزل میں ایک اور شعر یوں ہے

ہوا نہ کوئی کام معمول سے، گزارے شب و روز کچھ اس طرح
کبھی چاند نکلا غلط وقت پر کبھی گھر میں سورج اگا دیر سے

میرے اپنے مزاج اور حالات نے مجھے ہر مطلوبہ چیز تک تاخیر سے ہی پہنچایا ہے۔

میں اپنی ہی الجھی ہوئی راہوں کا تماشہ
جاتے ہیں جدھر سب میں ادھر کیوں نہیں جاتا

بنے بنائے محفوظ راستوں سے ہٹ کر چلنے کا خمیازہ میرا عذاب بنا۔ لیکن یہ دوہرے انتخاب کا نتیجہ تھا اس لئے شکایت کی گنجائش بھی نہیں ہے۔

اکرم نقاش : ہجرت و مہجوری اور بے گھری اگر ندا فاضلی کی زندگی کا حصہ نہ ہوتی تو کیا ہمارا تعارف اس ندا فاضلی سے ہوتا جس ندا فاضلی سے آج ہے؟

ندا فاضلی : میرے ادب کا بنیادی مزاج سوانحی ہے۔ میں فن کار کی موت پر تنقیدی فاتحہ خوانی کا قائل نہیں۔ میرے یہاں author بھی بہ قیدِ حیات ہے اور تخلیقی عمل سے اس کا رشتہ بھی

استوار ہے۔میراایک شعرمیرے تخلیقی رویہ کوظاہر کرتا ہے۔

یہ جو پھیلا ہوا زمانہ ہے
اس کا رقبہ غریب خانہ ہے

یہ سچ ہے میں افلاس و بدحالی کو میر کے دردوغم کی طرح ضروری نہیں سمجھتا۔لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ حالات انسانی اختیار میں نہیں ہوتے۔اوران کے سردوگرم الفاظ سے جھانکتے بھی ہیں۔لیکن اس سردوگرم کوفلسفہ بنائیے یا اس کے خلاف ارادہ کی دیوار اٹھائیے۔یہ ایک انفرادی عمل ہے۔میں نے فانی کی طرح ذاتی ناکامیوں سے فلسفہ نہیں تراشا غالب کی مانند آنکھ کو ہر رنگ میں وا ہوجانے کے طور پر اپنایا ہے۔ندافاضلی جو آج ہے وہ ارادہ وجبر کے مسلسل تصادم سے عبارت ہے۔

جتنی بری کہی جاتی ہے اتنی بری نہیں ہے دنیا
بچوں کے اسکول میں شاید تم سے ملی نہیں ہے دنیا
بڑے بڑے غم کھڑے ہوئے تھے رستہ روکے راہوں میں
چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے ہی ہم نے دل کو شاد کیا

اکرم نقاش : ہرانسانی کارگزاری کوئی افادی پہلو بھی رکھتی ہے۔کیا ادب اس دائرہ خیال سے باہر ہے؟ادب فی زمانہ عملی زندگی میں کس حد تک دخیل ہے؟

ندافاضلی : مسکراتا ہوا پھول،لہروں سے کھلتا چاند،ہواؤں میں ڈوبتی شاخیں،گاتے ہوئے پرندے اور ایسے بے شمار مناظر قدرت کی تخلیق سازی کے استعارے ہیں۔ان میں سے کسی کے عوض نہ ریلوے کا ٹکٹ خریدا جاسکتا ہے نہ بازار سے جوتا مل سکتا ہے۔پھر بھی ان کے ہونے سے ہمارے ہونے کا گہرا رشتہ ہے۔ایسی دنیا کا تصور جس میں پھول،چڑیاں، بچے اور ادب نہ ہو ممکن نہیں۔ادب کی افادیت،ادب کی ادبیت ہی ہے باقی سب غیر ضروری ہے۔ترقی پسندوں نے اس غیرضروری کوضروری سمجھا اور جدید ادب نے اس غیر ضروری کوفن کار کی معذوری سمجھا۔

اکرم نقاش : نظم ونثر دونوں اصناف میں آپ کی انفرادیت مسلم ہے،انفرادیت فطری امر ہے یا

ریاضت اسے درجۂ کمال تک پہنچا سکتی ہے؟

ندافاضلی : صلاحیت قدرت کی نعمت ہے لیکن اس کی حفاظت انسان کی ریاضت سے ہی ممکن ہے۔ تخلیقی عمل قدرت کا معجزہ ہے۔ جو انسانی اختیار میں نہیں ہے۔ یہ کب کس پر نازل ہوا اور کب کس سے دور ہوا، اس کی کوئی منطق بھی نہیں ہے۔ اگر تخلیقی عمل انسانی دسترس میں ہوتا تو کوئی ادیب وشاعر اپنی مرضی سے دوسرے درجہ کا ادیب وشاعر ہونا پسند نہیں کرتا۔ قدرت وبشریت کے امتزاج ہی تخلیقات ہے۔اس امتزاج کی تاریخی شاعروں میں کیٹس بھی ہے، مرزا غالب بھی ہیں، رلکے بھی ہیں، تو رودت بھی ہے۔

اکرم نقاش : فن صناعی یا کرافٹ کا کس حد تک متقاضی ہوسکتا ہے، میرے خیال میں ہمارے ہاں کرافٹ کی اعلیٰ ترین مثال غالب کی شاعری ہے لیکن روانی، برجستگی، الفاظ کا دروبست اور فنی التزام اس غضب کا ہے کہ اس کو صناعی ماننا دشوار بلکہ ناممکن نظر آتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ندافاضلی : کرافٹ یا صناعی سے آپ کی کیا مراد ہے! یہ سوال وضاحت طلب ہے۔ آپ نے سوال کو جواباً غالب کی شاعری سے جوڑا ہے۔ میرے خیال سے غالب کی شاعری صرف کرافٹ تک محدود نہیں ہے۔ کرافٹ تو داغ کے یہاں بھی ملتا ہے۔ غالب کے ہم عصروں میں ذوق اور مومن کا کلام بھی اس وقت سے روشن ہے۔ میرے خیال سے غالب اس آنکھ کا نام ہے جو اپنے عہد میں دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ درون بین تھی۔ وہ ہر رنگ میں وا ہو جانے کا طلسم تھی۔ اور یہی طلسم قدرت کا وہ معجزہ تھا جسے غالب ''غیب'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ (آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں) میرے خیال سے کرافٹنگ کا عمل تخلیقی عمل کا ایک حصہ ہے مکمل حصہ نہیں ہے۔ جس کے پاس کہنے کو اپنا کچھ ہوتا ہے۔ وہ میر درد کی زبان میں قبائے گل میں گل بوٹے نہیں ٹانکتا۔ بہت دشوار سی متوازن ہم رشتگی ہی تخلیقی جادوگری ہے۔

اکرم نقاش : آپ کے تخلیقی عمل اور نظریہ فن کے بارے میں تفصیل سے جاننا چاہوں گا؟

ندافاضلی : سنے ہوئے یا پڑھے ہوئے کے بہ جائے اپنے دیکھے ہوئے پر زیادہ اعتماد ہے۔ یہاں دیکھے ہوئے کو میں نے ''اپنے جیے ہوئے'' کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ مجھے جب بھی جو بھی جیسا نظر آتا ہے۔ ویسا ہی لفظوں میں ڈھل جاتا ہے۔ ضروری نہیں میرے دیکھے ہوئے سے دوسروں کا دیکھا ہوا ملے۔ لیکن اس اختلاف کے باوجود یہ میرے تخلیقی عمل کی ضرورت ہے۔ میں نے ایک عام آدمی کی زندگی جی ہے۔ لیکن اس زندگی کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اپنی سانسوں میں جیا ہے میرے ایک گیت کا مکھڑا ہے۔

تیرے پیروں چلا نہیں جو
دھوپ چھاؤں میں ڈھلا نہیں جو
وہ تیرا سچ کیسے جس پر تیرا نام نہیں

میں نے جس عام آدمی کی بات کی ہے وہ ہر آبادی میں اکثریت سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں اس کی زبان اور ذہن کو حاشیے پر سجا رکھا گیا ہے میں نے اس عام آدمی کو متوسط طبقہ کے فکری دائرہ سے باہر نہیں ہونے دیا۔ صوفیوں اور سنتوں کے حلقوں میں تلاش کیا ہے اور اسے اس کی زبان میں مخاطب کیا ہے۔

اکرم نقاش : کیا موجودہ ادبی صورت حال آپ کو ادبی طمانیت وآسودگی کا سامان فراہم کرتی ہے؟ ماضی قریب اور آج کے ادب میں آپ کوئی کمی محسوس کرتے ہیں؟

ندافاضلی : آج کا ادب زیادہ توانا اور کشادہ ہے۔ فکشن میں بھی شاعری میں بھی اور تنقید میں بھی۔ آج کا ذہن زیادہ انتخابی ہے۔ وہ میر کی طرح بھلے ہی چھ دیوان اپنے نام سے منسوب نہ کرتا ہو لیکن اس کی خود احتسابی عادتاً شعر گوئی کے خلاف ہے۔ ادب کارخانوں سے نکلی ہوئی اشیاء کی طرح سے ہر جگہ ایک جیسا نہیں ہوتا۔ اس لئے کسی بھی عہد کے ادب کو اجتماعی نظر کے بہ جائے انفرادی آئینوں میں پرکھنا چاہیے۔ اچھی شاعری پہلے بھی کہیں کہیں ہی ملتی تھی آج بھی کسی کسی کتاب میں ہی دیکھنا چاہیے۔ آج کی دنیا پہلے کی دنیا کے مقابلے میں زیادہ وسیع ضرور ہے۔ لیکن اس وسیع دنیا کو لفظوں میں سمیٹنے کے لئے ہر کسی میں ناظم حکمت، ویٹ مین، رابندر ناتھ ٹیگور اور پابلو کی تلاش بے سود ہے۔

اکرم نقاش : تخلیقی پرواز کے برخلاف ذاتی تجربات وزمینی حقائق آپ کے تخلیقی سروکار ہیں،غزل روایتی لفظیات،موضوعات اور مشاہدہ،تخیل سے مرصع کلام کی آپ کے نزدیک کیا اہمیت ہے؟

ندافاضلی : ذاتی تجربات وزمینی حقائق تک پہونچنے کے لئے بھی تخلیقی پرواز ضروری ہے۔ادب کی کوئی ایک تعریف ممکن نہیں۔میرا تخلیقی رویہ اس طرح جدا ہے جس طرح میں دوسروں سے الگ ہوں۔لیکن میں اپنے اسلوب وفکر کے ساتھ اپنے ان ہم عصروں کو بھی پسند کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔جو کئی سطحوں پر مجھ سے مختلف ہیں۔روایت زدگی ادب کے لئے نقصان دہ ہے۔ہر آنکھ کی دیکھی ہوئی دنیا دوسرے کی دنیا سے مختلف ہوتی ہے۔یہ بھی اختلاف زندہ ادب کی طاقت ہے۔

جیسی جسے دکھے یہ دنیا ویسے اسے دکھانے دو
اپنی اپنی نظر ہے سب کی کیا سچ ہے یہ جانے دو

اکرم نقاش : ادب میں تنقید کے رول پر آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

ندافاضلی : تنقید جب مصلحت یا تجارت بن جائے تو اس سے کنارہ کشی ہی بہتر ہے۔جس تنقید میں نظیر''ناشاعر''اور اکبرالہ آبادی''ہاں شاعر''ہوں۔اس سے دور رہنا ہی عقل مندی ہے۔لیکن ایسا نہیں ہے کہ میں تنقید کا سرے سے ہی قائل نہیں ہوں۔فراق، وارث، خلیل الرحمٰن اعظمی،حسن عسکری (اسلامی ادب والے نہیں) اور سلیم احمد وغیرہ آج بھی میرے پسندیدہ ناقدین ہیں۔میں اس تنقید کو پسند کرتا ہوں جس میں خود کم ادب فہمی کی توانائی زیادہ ہو۔

اکرم نقاش : ''ملاقاتیں'' خاکوں کا اپنی نوعیت کا منفرد مجموعہ ہے جس میں موضوع کے خدوخال کی مصوری سے زیادہ شخصیت کے درون میں جھانکنے اور اس کے نفسیاتی مطالعے کی کوشش زیادہ ملتی ہے۔میں''ملاقاتیں''کو''دیواروں کے بیچ''اور''دیواروں کے باہر''کے طرز اظہار کی تمہید کے طور پر دیکھتا ہوں۔حقائق اور انسانی کج رویوں کا بے کم وکاست اظہار،

شخصیت کے منفی پہلوؤں کا کھلا تخلیقی اظہار کسی تحریر کو دلچسپ تو بنا سکتا ہے لیکن اس طرح کی واقعہ گوئی خلاف تہذیب و اخلاق نہیں سمجھی جائے گی؟ اس کی بہت سی مثالیں مذکورہ کتابوں سے دی جا سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

ندافاضلی : تہذیب و اخلاق کی کوئی ایک تعریف ممکن نہیں۔ یہ عہد بہ عہد بھی بدلتی رہتی ہے اور ایک عہد میں مختلف ذہنی سطحوں کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ میری کتابوں کے تعلق سے جن منفی پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ آپ کی تہذیب و اخلاق کی تعریف کے مطابق ہے۔ ''دیواروں کے بیچ'' کے ان منفی پہلوؤں کے بارے میں سلام بن رزاق نے لکھا ہے۔

''اس کتاب میں مصنف نے اپنے بے باک قلم سے نہ صرف اپنی زندگی کو بے نقاب کیا ہے بلکہ سماج کے بعض نازک گوشوں سے بھی پردے اٹھائے ہیں''۔

ہر چند کہ اردو میں لکھی گئی خودنوشتوں کے مقابلہ میں ''دیواروں کے بیچ'' کا قلم زیادہ بے باک اور دھاردار ہے۔ لیکن جب ہم......مراٹھی زبان میں لکھی گئی خودنوشتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اردو ادب میں صداقتوں کو برہنہ کرنے کی جرأت ابھی پوری طرح پیدا نہیں ہوئی ہے۔

اکرم نقاش : شہریار، بانی، محمد علوی، جدید شاعری کے مختلف رنگ ہیں ان رنگوں کو آپ کس طرح دیکھتے ہیں، تفصیل سے بتائیں؟

ندافاضلی : ان ناموں میں کچھ اور ناموں کی شمولیت ہونی چاہئے۔ ان میں خصوصاً شاذ تمکنت، بشر نواز، بشیر بدر، عمیق حنفی، کمار پاشی اہم ہیں۔ یہ چاروں بھی آپ کے دیے ہوئے ناموں کی طرح جدید ادب میں مختلف رنگوں کی نمائندگی کرتے ہیں آپ کی فہرست میں سوائے محمد علوی کے مجھے کوئی صاحب اسلوب محسوس نہیں ہوتا۔ بانی کی غزل میکانکی ہے اور شہریار کی شاعری چھوٹے شہر کی ذہنی و فکری تنگی کا شکار ہے۔ ان دونوں کے مقابلہ میں محمد علوی کی شعری زبان زیادہ نئی اور انفرادی ہے۔ ان کے موضوعات سے بھی نئی آنکھوں

سے اردگرد کی زندگی کو دیکھنے والا انداز نمایاں ہے۔

اکرم نقاش : آپ ایک معتبر شاعر و صاحب طرز ادیب ہیں، فلموں سے بھی آپ وابستہ ہیں، ایک ایسا شاعر جس کی شعری زبان سہل، عربی فارسی کی ثقالت سے منحرف اور ہندی سے قریب بھی نظر آتی ہے، اس سب کے باوجود آپ کے حصے میں بہت کم فلمیں آئیں اس کے کیا اسباب ہیں؟

ندافاضلی : میں نے فلموں کے لیے اپنی شرائط پر لکھا ہے۔ اس لئے کم بھی لکھا ہے۔ میں نے فلموں کے علاوہ بھی دوسرے شعبوں کے لئے لکھا ہے۔ ہندی، اردو میں کالم بھی لکھے ہیں۔ بی بی سی لندن کے لیے بھی مسلسل لکھا ہے۔ سیریل بھی لکھے ہیں۔ مکالمے بھی گیت بھی، میں کامیابی کو فلموں کی گنتی سے نہیں ناپتا، لکھے ہوئے ادبی وقار سے ناپتا ہوں۔ میں نے فلموں کے لئے جتنا لکھا ہے اس سے میں مطمئن ہوں

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا

اکرم نقاش : ہندی سے آپ کی دل چسپی کی وجوہات کیا ہیں؟ اردو کا مستقبل ایک سلگتا سوال ہے، اردو کے مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ندافاضلی : میری دلچسپی صرف ہندی سے ہی نہیں ہے۔ دوسری زبانوں سے بھی ہے۔ میں نے گجراتی میں دس کتابیں ایڈٹ کی ہیں۔ میں نے مراٹھی میں لکھا ہے۔ اس میں دو کتابیں ہیں۔ ہندی میں دس گیارہ کتابیں، ہر زبان کا مستقبل اس زبان کے اقتصادی رشتے سے قائم ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اردو سیاست کی چال بازیوں کی شکار ہے۔ ہر سیاسی پارٹی اسے مسلمانوں سے جوڑ کر اپنا الو سیدھا کرتی ہے اور مسلمان ہر بار، ہر چناؤ میں اس جھانسے میں آجاتے ہیں۔ اردو کا جب تک معاش سے رشتہ قائم نہیں ہوگا اس کا مستقبل زیادہ روشن محسوس نہیں ہوتا۔

اکرم نقاش : انعامات و اعزازات کی حیثیت فی زمانہ کیا ہے؟ آپ ممبئی کے بہ جائے علی گڑھ یا دہلی

میں ہوتے تو کس انعام کے مستحق ہوتے؟

ندافاضلی : انعامات کے لین دین میں تجارت شامل ہوگئی ہے۔ممبئی کے بیش تر فلمی انعامات کھلم کھلا بولی لگا کر بیچے جاتے ہیں۔ادب میں بھی یہی صارفیت داخل ہوچکی ہے۔

اکرم نقاش : آپ نے جو کچھ لکھا اوراس کے بدلے میں آپ نے جو کچھ پایا کیا آپ اس سے مطمئن ہیں یا ایسی کوئی تحریر آپ کے نوک قلم تک پہنچنے کے لئے اب بھی بے تاب ہے؟

ندافاضلی : میرا ایک شعر ہے

زندگی کا مقدر سفر در سفر
آخری سانس تک بے قرار آدمی

●●

(مطبوعہ اذکار 22۔مارچ 2013، بنگلور)

لے ''اب ایک ناخوش گوار واقعے کی گونج بھی سن لیجئے ''تریاق'' کے تیسرے شمارے میں کچھ تکنیکی غلطیوں کی وجہ سے محترم ندافاضلی سے اکرم نقاش کا لیا ہوا انٹرویو میر صاحب حسن کے نام سے شائع ہوگیا ہم اس سلسلے میں اپنے قارئین اور محترم اکرم نقاش سے تہہ دل سے معذرت خواہ ہیں۔ایک نئے رسالے کی ترتیب وتزئین میں اس قسم کی غلطیاں فطری طور سے راہ پا جاتی ہیں۔ہم بھر پور کوشش کریں گے کہ آئندہ ایسا نہ ہو جس سے اکرم نقاش جیسے ذہین اور جذباتی فن کاروں کی دل آزاری کا اور ہماری شرمندگی کا سبب بنیں۔ظاہر ہے کہ کسی اور کی تحریر ہمارے قلم سے منسوب ہو جائے تو یہ ہمارے لئے بھی ایک اذیت ناک اور ناگوار مرحلہ ہوگا۔

(ماہنامہ ''تریاق''،ممبئی،نومبر ۲۰۱۱ء ص ۹) ''مدیر تریاق''

بشر نواز

نام : بشارت نواز خان

قلمی نام : بشرنواز

پیدائش : 18/ اگست 1935ء، اورنگ آباد(مہاراشٹر)

وفات : 9/ جولائی 2015ء، اورنگ آباد(مہاراشٹر)

مصروفیت: فلمی نغمہ نگاری، اسکرپٹ رائٹنگ، ریڈیو ڈرامے
ان کے نغموں کو لتا منگیشکر، مہدی حسن، غلام علی، بھوپیندر ہزاریکا، آشا بھوسلے، محمد عزیز اور طلعت عزیز وغیرہ نے اپنی آواز دی۔

تصانیف : 1) رائیگاں (شاعری)
2) اجنبی سمندر (شاعری)
3) نیا ادب نئے مسائل (تنقید)
4) متعدد تحریریں مراٹھی، ہندی، پنجابی اور انگریزی میں ترجمہ ہوئیں۔

انعامات و اعزازات: 1) پولوتسوسمان برائے ''مجموعی ادبی خدمات''
2) غالب ایوارڈ برائے ''مجموعی خدمات''

بشر نواز سے ایک مکالمہ

اکرم نقاش : پچھلے کچھ برسوں سے یہ سوال بازگشت میں ہے کہ موجودہ غزلیہ شاعری یکسانیت کا شکار ہوگئی ہے اس کی لفظیات اور اسلوب میں کوئی واضح فرق محسوس نہیں ہوتا۔ آپ کیا محسوس کرتے ہیں اگر ایسا ہے تو اس کے اسباب کیا ہیں؟

بشر نواز : پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ یا دوسرے لوگ تبدیلی سے کیا مراد لیتے ہیں۔ اگر بالکل ہی نئی لفظیات یا نئے موضوعات آپ کے ذہن میں ہوں تو شاید یہ ممکن نہیں ہے۔ میں اس بات کا قائل ہوں کہ تمام تبدیلیاں وقت کے ساتھ ساتھ اور صنف ادب کے مزاج کے ساتھ ساتھ ہوتی ہیں۔ غزل اپنی ہئیت کے اعتبار سے ایک مخصوص ہئیت ہے اس کی اپنی کچھ وسعتیں اور اپنی کچھ Limitations بھی ہیں۔ ہر اچھے شاعر نے ان Limitations میں رہ کر غزل میں تبدیلیاں کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موضوعات، لفظیات اور اسلوب کے اعتبار سے آج کی غزل وہ غزل نہیں ہے جو مثال کے طور پر قلی قطب شاہ، یا شاہی کی تھی۔ خیر یہ تو بہت دور کی بات ہوگئی۔ آج کی غزل کہیں نہ کہیں ولی اور سراج کی غزل سے بھی الگ ہے اور ترقی پسندوں کی غزل سے بھی الگ ہے۔ آج کی اچھی غزل لفظی پریڈ والی غزل بھی نہیں ہے۔ یقیناً اس میں تبدیلیاں بھی ہوئی ہیں لیکن وہ تبدیلیاں ممکن ہے سرسری نظر سے دیکھنے پر نظر نہ آئیں۔ میرا خیال ہے کہ اچھے ادب کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ماضی سے جڑا ہوتے ہوئے بھی ہم عصر زندگی کا عکاس ہو اور ادیب یا شاعر کے ذہنی اور جذباتی کیفیات کی بھی آئینہ داری کر سکے۔ شاعر بھی سماج کا

ایک فرد ہوتا ہے سماج میں ہونے والی تبدیلیاں اس پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں جنھیں وہ اپنی زندگی کے کوائف اور اپنے ذاتی تجربہ اور ان تجربوں سے پیدا ہونے والی نفسیاتی وفکری کیفیات کے ساتھ آمیز کرکے شعر کا روپ لیتا ہے۔ رہی لفظیات کی بات تو اگر زندگی بدل رہی ہے تو لفظیات کو بھی بدلنا ہوگا۔ بہت سارے پرانے الفاظ ٹکسالی الفاظ، پس پشت پڑ جائیں گے اور ان کی جگہ نئے الفاظ لے لیں گے۔ میرے اپنے خیال کے مطابق نئے الفاظ وضع کرنا یا پرانے الفاظ کو نئی معنویت دینا یا بعض جذباتی اور احساساتی کیفیات کے اظہار کے لیے وقفوں اور محذوفات سے کام لینا یہ شاعر کی فنی بصیرت پر منحصر ہے۔ ویسے بھی سیاہ کے مقابلے میں سفید یا اندھیرے کے مقابلے میں نور رکھ دینا کوئی اچھی فن کاری نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی جدت نظر آتی ہے کیوں کہ یہ ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔ لکھنے والے نے رائج الوقت سکے کے دوسرے پہلو کو لے لیا تو یہ کام تو بچہ بھی کرسکتا ہے۔ اور ابتدائی جماعتوں ہی میں یہ باتیں سکھادی جاتی ہیں فن کار کا امتحان تو اس وقت ہوتا ہے کہ جب وہ رائج الفاظ سے بدکنے کے بہ جائے ان سے نئے نئے تلازمے تلاش کرے یا ان کی رائج ترتیب میں کچھ ردو بدل کرکے نئی معنویت پیدا کرلے۔ اس کے علاوہ بھی ایک بات ہے وہ یہ کہ اگر لفظ شاعر کی دلی کیفیات وجذبات کے اظہار کے لیے بے ساختگی سے وارد ہو جاتا ہے تو یقیناً اس میں اس کا جذبہ واحساس بھی شامل ہوگا اور کیوں کہ وہ احساس گذشتہ کے مقابلے میں نیا ہوگا اس لیے لفظ کی معنویت میں بھی کسی نہ کسی حد تک نیا پن آجائے گا۔

اکرم نقاش : اچھے شعر یا اچھی شاعری کی تعریف علمائے ادب نے مختلف انداز میں کی ہے۔ کسی کے یہاں مواد کی اہمیت ہے تو کسی کے پاس ترسیل بے مثل ہے کسی کی نظر میں اسلوب سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ آپ کے نزدیک اچھی اور سچی شاعری کی تعریف کیا ہے؟

بشر نواز : اچھی اور سچی شاعری کی اولین پہچان تو یہ ہے کہ وہ اپنے باذوق سامع یا قاری کو فوری طور پر اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور وہ توجہ مضحکہ اڑانے کے لیے نہ ہو بلکہ قاری اور شاعر کے درمیان پیدا ہونے والی اپنچھی کا نتیجہ ہو یعنی کہنے والے اور سننے والے کے جذبات و

احساسات ایک ہو جائیں۔ یہ باتیں بہت پرانی ہیں ولی سے لے کر آج تک ہر شاعر نے یہ بات کہی ہے غالب کا ایک شعر سنئے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اکرم نقاش : جدیدیت کے آغاز میں غزل کے ساتھ ساتھ آزاد نظم بھی اسی شدت سے تخلیق پا رہی تھی۔ ادھر کچھ برسوں سے اچھی نظمیں بہت کم پڑھنے کو مل رہی ہیں۔ اور نظم لکھنے والوں کی تعداد بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ اگرچہ غزل کے مقابلے میں آزاد نظم جکڑ بندیوں اور فنی قیود سے نسبتاً زیادہ آزاد بھی ہے۔ آج ن م راشد نظر آتے ہیں نہ اختر الایمان، قاضی سلیم ملتے ہیں نہ بلراج کومل، ندا فاضلی ہیں نا عمیق حنفی اس کی کیا وجوہات ہیں؟

بشر نواز : دیکھیے ہر دور میں کئی تحریریں سامنے آتی ہیں لیکن ان میں سے چند ہی پڑھنے والوں کو متوجہ کرتی ہیں نظمیں تو آج بھی لکھی جا رہی اور اچھی بھی لکھی جا رہی ہیں لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ ایک عام دستور کے مطابق اچھی اور بری دونوں طرح کی ہیں۔ مثلاً عتیق اللہ، صادق، خلیل مامون، عبدالاحد ساز، عنبر بہرائچی، سلیم شہزاد، جینت پرمار وغیرہ لیکن آپ کہیں گے۔ یہ تو ۸۰ سے پہلے والے ہیں ان کے بعد نعمان شوق، مظفر ابدالی، فرحت احساس، کوثر مظہری، جمال اویسی، عین تابش، شکیل اعظمی، چندر بھان خیال، راشد انور وغیرہ ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اچھے نظم گو ہیں، نام یاد نہیں آ رہے ہیں۔ خواتین میں شہناز نبی، عفت زرین، ملکہ نسیم اور شائستہ یوسف ہیں ان سبھی نے غزلوں کے ساتھ عمدہ نظمیں بھی کہی ہیں۔ خود آپ کے یہاں خالد سعید ہیں اور آپ خود ہیں اور شاید ساجد حمید بھی وہیں کے ہیں صادق سحر ہیں۔ آج کا قاری چوں کہ آج کے دور میں سانس لے رہا ہے لکھنے والے اور اس کے پڑھنے والے میں وہ زمانی فاصلہ جو ادب کی پرکھ کے لیے ضروری ہوتا ہے نہیں ہے اس لیے اس قسم کی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ۳۵ سے ۴۰ کی تنقید دیکھیے اس میں فیض، مخدوم سردار جعفری کے نام کہاں نظر آتے ہیں اس تنقید کے اہم نام کچھ اور تھے جو آج بھلا دئے گئے ہیں۔ ۸۰ کے بعد کے کئی شعرا کہیں نہ کہیں اپنی

صلاحیتوں کا احساس دلاتے ہیں کچھ نظمیں بہت اچھی ہیں اور کچھ نسبتاً کم زور، تو یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ البتہ آپ کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ آج غزل کے مقابلے میں نظم کم کہی جا رہی ہے تقریباً یہ تمام شعرا غزل کے ساتھ نظم بھی کہتے ہیں۔ صرف نظم نہیں کہتے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں جن پر غور کرنا پڑے گا۔ مثلاً مشاعرہ بازی ادب کو وقت گزاری کے لیے پڑھنا یا مشروط ذہن کے ساتھ شعری مجموعوں کی ورق گردانی کرنا۔

اکرم نقاش : ''رائگاں'' کا شاعر بلا شبہ ایک جدید شاعر ہے اور اس میں شامل بیش تر تخلیقات جدیدیت کے عروج کے دور میں لکھی گئی ہیں۔ اس میں شامل غزلیں نظمیں ایک متوازن و معتدل شعری رویے کی مظہر ہیں جو جدیدیت کے ارتقائی دور کی تخلیقات سے قطعی طور پر متغائر معلوم ہوتی ہیں۔ ''سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا'' اور ''اری سالی جلدی سے جمپر گرا'' یا ''ریل چلتی نہیں گر جاتا ہے پہلے سگنل'' یا اسی طرح کے اور بھی بہت سے اشعار کے چونکانے اور موضوع بحث بننے والے شعری اسلوب نے آپ کو اپنی طرف راغب کیوں نہیں کیا؟

بشر نواز : آپ کے پاس میرے مضامین کا مجموعہ ہوگا۔ اور اگر ہوگا تو آپ نے پڑھا بھی ہوگا۔ اس میں پہلا ہی مضمون ہے جس میں میں نے اپنی شاعری کے بارے میں کافی تفصیل سے بات کی ہے۔ یہ مضمون فاروقی نے لکھوایا تھا اور یہ وہی زمانہ تھا جب ہماری شاعری میں کچھ مرغے بلیاں، کتے وغیرہ بھی در آئے تھے اور کچھ لوگوں نے صوفیانہ انداز سے جنسی معاملات پر شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ بدقسمتی سے ان لوگوں کے ذہن میں نئی شاعری کا تصور ہی کچھ اس قسم کا تھا۔ آپ نے جتنے مصرعے دیے ہیں وہ سب میرے بہت اچھے دوستوں کے ہیں۔ ان کے کلام میں اس قسم کے اشعار آٹے میں نمک کے برابر ہیں جیسے پہلا مصرعہ ندا کا ہے دوسرا مصرعہ محمد علوی کا ہے تیسرا مصرعہ سلیم احمد کا ہے۔ آپ ان لوگوں کے مجموعوں پر نظر ڈالیں تو اس قسم کے اشعار بڑی تلاش کے بعد ملیں گے۔ لیکن آپ متوجہ ہوئے اور انھیں کو نشان زد کیا۔ اس زمانے میں بھی شاید ان لوگوں کے ذہن میں یہی تھا کہ لوگ فوری طور پر متوجہ ہو جائیں۔ تا کہ ان کی سچی شاعری کی طرف توجہ دی

جا سکے۔ ویسے یہ رویہ کچھ کم زوری کا تو اظہار کرتا ہے شاید جلد از جلد اپنی طرف متوجہ کرنے کی خواہش یا شاید نقادوں کو متوجہ کرنے کی خواہش (خواہ برائی ہی سے کیوں نہ ہو) بہ ہر حال وہ ایک عبوری دور تھا اور اس کے گزر جانے کے بعد ہی صحیح جدید ادب سامنے آیا۔ میں نے اپنے اسی مضمون میں لکھا تھا کہ جب سیلاب آتا ہے تو اس کی اوپری سطح پر خس و خاشاک اس شدت سے نظر آتے ہیں کہ اصلی اظہارات ان میں چھپ جاتے ہیں۔ تبدیلیوں کے دور میں بھی یہ ہونا تھا سو ہوا۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے میں شروع ہی سے ادب کو اظہار ذات اور اپنی ذات کے حوالے سے معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا قائل ہوں۔ شاید اسی وجہ سے میں اس قسم کی انتہا پسندیوں سے بچا رہا۔ یہ بات الگ ہے کہ بعض لوگوں نے میری شاعری میں روایتی اثرات کی نشان دہی کی روایتی تو خیر کسی نے نہیں کہا۔ لیکن اس زمانے میں لفظ روایت ہی برائی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ دراصل وہ لوگ روایت کی طاقت اور روایتی پن میں فرق نہیں کر سکتے تھے۔

اکرم نقاش : سرزمین اورنگ آباد سے ولی اور سراج جیسے باکمال شعرا نے غزل کے دامن کو مالا مال کیا وہیں قاضی سلیم اور شفیق فاطمہ شعری جیسے نظم نگاروں نے جدید نظم کی وسعتوں اور رفعتوں کی تلاش و جستجو کی اور جدید نظم کو نیا رنگ و آہنگ و اعتبار بخشا۔ تاہم ایسا لگتا ہے قاضی سلیم اور شفیق فاطمہ شعری کا فن اہل نقد ونظر سے آج بھی خراج کا متقاضی ہے۔ ان شعرا کے ساتھ تنقید نے وہ سلوک روا نہیں رکھا جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔ Genuine فن کاروں کے ساتھ ایسا اکثر ہوتا ہے کیوں؟

بشر نواز : جیسے میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ جس طرح کسی واقعہ یا موضوع اور فن کار میں تھوڑا سا فاصلہ ہونا ضروری ہوتا ہے بعض فن کاروں اور قاری میں زمانی فاصلہ ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ویسے آج شعری پر بھی کافی مضامین آئے ہیں جس میں شاید ان کی شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اسی طرح قاضی سلیم پر بھی لکھا جا تا رہا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا۔

اکرم نقاش : اپنے مضمون ''کچھ جدید شاعری کے بارے میں'' میں آپ نے نقالوں اور فیشن پرست

ادیبوں کی خوب شناخت کی ہے۔لیکن یہ بات بھی مسلم ہے کہ صلاحیت کے فقدان کے باوجود پکی روشنائی میں اپنا نام چھپا دیکھنے کی تمنا رکھنے والے ہر دور میں رہے ہیں اور ان کی تعداد بھی قابل لحاظ رہی ہے۔لیکن بنیادی مسئلہ اس طرح کے لکھنے والوں کی ہمت افزائی اور پشت پناہی کا ہے۔کیا آپ کو نہیں لگتا کہ بے سروپا تحریریں اور چیستانی ادب کے فروغ میں جرائد ورسائل کے مدیران وذمہ داران کا رول بھی کافی اہم رہا ہے؟

بشر نواز : نظری طور پر آپ کی بات درست معلوم ہوتی ہے کہ رسالوں میں اچھی ادبی چیزوں کے ساتھ ساتھ کچھ بھرتی کا مواد بھی شائع ہوتا ہے۔ جو نہیں ہونا چاہیے۔ میں بھی اس بات سے متفق ہوں۔لیکن اس کے عملی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہر اچھے رسالے کو اپنی مقررہ تاریخ پر شائع کیا جانا ضروری ہے کیوں کہ ہر رسالے سے اس کے خریدار یہی توقع رکھتے ہیں۔اب یہ مدیر کی ضرورت کہیے یا مجبوری کہ اسے دستیاب مواد ہی میں سے کچھ منتخب مواد شائع کرنا پڑتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہر مدیر اپنے قارئین سے بھی کچھ توقعات رکھتا ہے یعنی یہ کہ قارئین خود بھی اس کے فراہم کردہ مواد میں سے اپنی پسند کی چیزیں چن لیں اور باقی مواد کو رد کردیں۔ مجھے یاد نہیں کہ کس کا قول ہے شاید ہیگل کا کہ ہر چھپی ہوئی چیز ادب نہیں ہوتی۔ یہاں ہیگل ناشر یا چھاپنے والے کے ساتھ ساتھ پڑھنے والے کی ذمہ داری کی طرف بھی اشارہ کرتا نظر آتا ہے کہ قاری بھی پکی روشنائی میں چھپی ہوئی ہر تحریر کو ادب کے زمرے میں شامل نہ کرے۔فنون (پاکستان) نے جب غزل کا پچاس سالہ نمبر چھاپا تو اس میں کچھ ایسی غزلیں بھی شامل کیں جن کو غزل کہنا ہی غزل پر ظلم کرنا ہوگا۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوا کہ مدیر فنون احمد ندیم قاسمی ان غزلوں کو اچھی غزل تو کجا غزل بھی سمجھتے تھے۔ اپنے اداریے میں انھوں نے اس کا ذکر بھی کیا تھا کہ کچھ جانے پہچانے شعرا نے ایسی غزل بھیجی ہے کہ مجھے حیرت ہوئی ہے لیکن وہ غزلیں انھوں نے شاید اس لیے شائع کیں کہ قارئین کو بھی اس بات کی اطلاع ہوجائے کہ آج کل ادب کے نام پر کیا کچھ ہورہا ہے۔ کچھ یہی صورت حال ہر رسالے کے مدیر کو پیش آتی ہے۔اب آپ دیکھیں کہ شب خون جس نے اس قسم کے تجربوں کو بہت بڑھاوا دیا تھا۔ جب اپنے ہی رسالے کا چالیس سالہ انتخاب چھاپتا ہے تو اس میں زیر بحث قسم کی تحریروں میں سے کتنوں کو جگہ ملتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نمبر میں سے ایک تحریر بھی ایسی نہیں ہے کہ جس پر غیر

ادب ہونے کا الزام لگایا جاسکتا ہے۔شب خون کے تقریباً ۷۰۰ صفحات میں زیادہ تر وہی تخلیقات لی گئی ہیں جو ادب کے معیار پر بھی پوری اترتی ہیں اور رسالے کے مدیر کی نظر میں بھی ادب کہلانے کی مستحق ہے۔اس کے باوجود ممکن ہے کچھ تخلیقات کسی قاری کے معیار پر پوری نہ اتریں اور یہ ہونا کوئی عجوبہ نہیں ہے۔ ہر پڑھنے والے کی اپنی پسند اور ناپسند بھی ہوتی ہے اور اسے یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ کچھ چیزوں کو قبول کرے اور کچھ کو رد کرے۔ہمیں دیکھنا یہ ہوگا کہ قاری کی انفرادی پسند و ناپسند سے ہٹ کر ادب کے اصولوں پر وہ تخلیقات پوری اترتی ہیں یا نہیں۔ یہاں بھی ایک مشکل یہ پیش آتی ہے کہ ادب کے مختلف نظریات ہیں۔اور ہر نظریہ کی کسوٹی ایک دوسرے سے جدا ہے۔لیکن اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ان نظریاتی اختلافات میں بھی کوئی نہ کوئی قدرِ مشترک موجود ہے ہر زبان کی اپنی روایت ہوتی ہے اس کے کلیدی لفظوں کے ساتھ کچھ تلازمے ہوتے ہیں جو اس زبان کے بولنے والوں کے لیے معنویت کی نئی سطحیں اجاگر کرتے ہیں مثلاً یہ کہ ہمارے یہاں ایک لفظ نقاب مختلف معنی میں استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کبھی بڑے خوب صورت اور دل کش کے ہیں اور کبھی اس کے برعکس بھی ہوتے ہیں۔مثلا نقاب پوش، ڈاکو، اور چور بھی ہوسکتا ہے کوئی سماجی مجرم بھی اور کوئی حسینہ بھی اب اس لفظ کو استعمال کرنے والے پر یہ منحصر ہے کہ وہ جس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے یہ لفظ استعمال کررہا ہے اسے ایسے سیاق وسباق میں استعمال کرے کہ پڑھنے والا اس کے مفہوم تک پوری طرح نہ سہی کسی نہ کسی حد تو پہنچ ہی جائے۔غالب کا ایک مشہور شعر ہے۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

یہاں نقاب آرائش، آئینہ، سبھی ایک دوسرے کے تلازمے ہیں اور اس بات کا بھی اشارہ کرتے ہیں کہ یہ نقاب محض کپڑے کا ایک ٹکڑا نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔اور اسے ہم بڑی آسانی سے کائنات کی تخلیق سے لے کر (اس کے مسلسل تخلیقی عمل جو ہر لمحہ جاری وساری ہے) مسلسل تحرک تک جاری ہے۔اب اگر ہم اس کو تصوف کے مسئلے سے ملا کر دیکھیں کہ کائنات کو تخلیق کرنے والا جمیل ہے اور وہ اپنی کائنات کے حسن کو یعنی خود اپنے حسن کو مسلسل سنوارنے میں مصروف ہے تو شاید غالب کے اس شعر کے

ساتھ بھی انصاف کرسکیں اوراپنے ذوق کے ساتھ بھی شاید اسی قسم کی بات اقبال نے بھی قطعی دوسرے لفظوں میں کہی ہے۔

ابھی یہ کارِ جہاں ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکوں

اکرم نقاش : جدیدیت کے زیراثر تخلیق پانے والے ادب میں متعدد منفرد آوازیں مل جاتی ہیں شاعری میں زیادہ اورفکشن میں نسبتاً کم۔ جہاں تک انفرادیت وتجربہ پسندی کا سوال ہے فی زمانہ ایسی آوازوں کوانگلیوں پرشمار کرنا بھی دشوار ہے۔اس کی بہت سی وجوہات میں ایک اہم وجہ قلم کاروں کوشب خون جیسے پلیٹ فارم کا میسرآنا بھی معلوم ہوتا ہے۔شب خون کے علاوہ کسی اور رسالے نے شاید ہی وہ جرات کی ہو کہ ہرطرح کی تحریر ہرطرح کی تجربہ پسندی کو قارئین تک پہنچایا ہو۔اگر شب خون نہ ہوتا تو شاید اتنے تجرباتی رنگ ومتنوع تحریریں سامنے نہ آتیں۔اس سلسلے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

بشرنواز : آپ کا یہ خیال بالکل صحیح ہے،مختلف اورمتنوع آوازوں کولوگوں تک پہنچانے کے لیےکوئی اچھا اور باوقار ذریعہ ہونا ضروری ہے اور یہ ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔آپ نے یقیناً پڑھا ہوگا کہ مولانا صلاح الدین احمد کے رسالے''ادبی دنیا'' میں ترقی پسند اوراس دور کے جدید دونوں طرح کےافسانہ نگاروں کی تخلیقات کواس طرح نمایاں کرکے چھاپا گیا کہ وہ نام افسانوی ادب کا وقار بن گئے۔کرشن چندر،منٹو،راجندرسنگھ بیدی،عزیز احمد وغیرہ کی صلاحیتوں کو پوری طرح سے روشناس کروانے میں'ادبی دنیا' کا بہت بڑا رول رہا ہے۔ اسی طرح اسی پرچے میں میراجی نے جدید نظم کے بارے میں بہت کچھ لکھا۔اورشاید کچھ نظموں کے تجزیوں کا بھی سلسلہ شروع کیا۔''ساقی'' میں ''جھلکیاں'' کےعنوان کےتحت اس دور کی نئی تخلیقات کے بارے میں مختصر انداز میں بڑے دل کش اور بامعنی اشارے دیے جاتے تھے دور کیوں جایئے ہمارے یہاں آزادی کے بعد'سوغات' 'صبا'اور'شب خون' جیسے رسالوں نے نئے ادب اور نئے ادیبوں کو روشناس کروانے میں غیرمعمولی کردارادا کیا ہے۔کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی پلیٹ فارم کا ہونا تو ضروری ہے۔البتہ شرط

یہ ہے کہ اس رسالے کا ایڈیٹر یا اس کی مجلس مدیران خود بھی اتنی طاقت رکھتی ہو کہ وہ اپنے رسالے کی تحریروں کو معتبر بنا سکے اور شاید اسی لیے ہر اچھے رسالے کا ایک مزاج ہوتا ہے یا ہونا چاہیے۔'شب خون' میں چھپنے والی چیزوں کے تعلق سے ایک بات تو ماننی پڑے گی کہ ان تجرباتی تحریروں کی وجہ سے کچھ نیا کرنے کا ایک رجحان تو پیدا ہوا۔کئی نئے لکھنے والے تبدیلیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور نئے نئے انداز کی چیزیں سامنے آنے لگیں۔اس کو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ'شب خون' نے آزادی کے بعد پیدا ہونے والے ادبی جمود کو توڑنے کا کام انجام دیا۔یہ بات الگ ہے کہ اس میں چھپنے والی کچھ تحریریں شاید پوری طرح سے ادبی معیار پر پوری نہ اتر سکیں جسے خود بعد میں'شب خون' ہی نے رد کردیا لیکن تجربات کی ایک اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ بعد میں آنے والے لوگ ان تجربات سے عبرت حاصل کر سکتے ہیں اور کچھ بصیرت۔

اکرم نقاش : خبر نامہ شب خون ۱۸/ میں جناب ظفر اقبال کا ایک تبصرہ نظر سے گذرا جس میں انھوں نے مجروح سلطان پوری سے لے کر بانی زیب غوری، محمد علوی، شہریار اور عرفان صدیقی جیسے جدید شعرا کو موزوں گو قرار دیا ہے اور یہ بھی کہ بھارت میں جدید غزل کا دور دور تک پتہ نہیں ۔ان معتبر جدید شعرا کو موزوں گو قرار دینا کہاں تک درست ہے۔اس طرح کی بیان بازی کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں اور ظفر اقبال کی شاعری آپ کو کس کیفیت سے دوچار کرتی ہے؟

بشرنواز : ظفر اقبال کی ایک کامیابی تو یہی ہے کہ انھوں نے آپ کو بھی فوری طور پر متوجہ کرلیا۔اگر وہ اس قسم کی رائے کا اظہار نہ کرتے تو ممکن ہے کہ آپ کے ذہن میں ان کا نام ہی نہ آتا۔ان دنوں ان کا اور شمس الرحمٰن فاروقی کا تنازعہ موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ممبئی سے نکلنے والے پرچے'تحریر نو' میں مدیر'اثبات' اشعر نجمی کا ایک طویل خط چھپا ہے۔خط کیا ہے مضمون ہی ہے جس میں انھوں نے اس مسئلے کو صاف کرنے کی کوشش کی ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے ظفر اقبال کو غالب کے برابر یا ان سے بڑا شاعر مانا ہے۔حالاں کہ اس بات میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔شمس الرحمٰن نے کچھ اور کہا تھا جس کا مطلب شاید ظفر اقبال نے یہ نکال

لیا کہ شمس الرحمٰن انھیں غالب سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس قسم کے اسٹنٹس کو کوئی اہمیت نہیں دینی چاہیے اور نہ اس پر بحث ہوسکتی ہے۔ ظفر اقبال نے اچھی غزلیں بھی کہی ہیں آبِ رواں اور گل آفتاب کی آدھی غزلیں اچھی خاصی ہیں ان میں نیا پن بھی ہے اور ایک تیکھا لب ولہجہ بھی۔ انھیں زبان وبیان پر قدرت بھی حاصل ہے۔ لیکن بدقسمتی سے انھوں نے لکھنؤ کی ریختی اور اس میں لفظوں کے الٹ پھیر کو زیادہ اہمیت دینی شروع کردی اور اس قسم کی غزلیں کہنے لگے۔

لڑکی ہے یا لکڑ کرتی اکڑ مکڑ
شکر ہے لاہوری اسی لیے ہیں شکڑ

وغیرہ وغیرہ......اب یہ شاعری واعری تو ہے نہیں۔ ہاں! لوگوں کو برانگیختہ کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور اس میں وہ کامیاب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے بھی اس قسم کا ایک سوال اٹھایا۔ میرے مضامین کے مجموعہ میں غزل کے بدلتے ہوئے رجحانات کے اچھے اور برے پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے ظفر اقبال کی اس قسم کی شاعری کے بارے میں بھی دوایک جملے لکھے ہیں۔ آپ وہ مضمون دیکھ لیں۔ یا پھر شاعر کے اس شمارے کو دیکھ لیں جس میں رطب ویابس، پر میرا تفصیلی تبصرہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں اتنا کافی ہے۔ اس قسم کی مباحث میں وقت گنوانا اچھی بات نہیں ہے۔

اکرم نقاش : آپ کے ہم عصروں میں محمد علوی ایسے صاحبِ اسلوب شاعر ہیں جن کی شاعری میلوں دور سے ہی اپنا تعارف کرواتی ہے اور جن کا تتبع قریب قریب ناممکن نظر آتا ہے۔ لیکن کچھ خشک فکر اہلِ نظر حضرات کا خیال ہے کہ اس طرح کی شاعری فطری آسودگی اور روحانی کیف بہم پہنچانے سے قاصر ہے۔ شاعری حظ وانبساط کی کسی ایک سطح کو سیراب کردے کیا یہ کافی نہیں؟

بشر نواز : محمد علوی اچھے اور صاحب طرز شاعر ہیں۔ ان کے مشاہدے میں بچوں کی سی معصومیت اور دردمندی نمایاں ہے۔ ان کی بیش تر نظمیں اختتام پر پہنچتے پہنچتے پڑھنے والے کو یقیناً ایک انبساط سے دوچار کرتی ہیں۔ شاید ہمارے یہاں سیدھی سادی زبان اور بچوں جیسا معصوم

طرز اظہار زیادہ متوجہ نہیں کرتا۔ حالاں کہ اس اسلوب میں چونکانے کی بڑی قوت ہے۔ علوی کی بہت سی نظمیں صرف چونکاتی ہی نہیں بلکہ سوچنے پر بھی مجبور کر دیتی ہیں۔ کیا یہ خصوصیت اچھی شاعری کے لیے کافی نہیں؟

اکرم نقاش : آپ شاعر ہیں اور نقاد بھی، کتاب ''نیا ادب نئے مسائل'' آپ کے تنقیدی نظریات کی آئینہ دار ہے۔ ہندوستان میں موجودہ تنقیدی صورت حال کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ آپ کے پسندیدہ نقاد کون ہیں یا کون کون ہیں؟

بشر نواز : پہلی بات تو یہ کہ میں اپنے آپ کو تکنیکی معنی میں نقاد نہیں سمجھتا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ میرے مضامین میں نہ بیرونی نقادوں کے ناموں کی کھتونی ہوتی ہے اور نہ موضوع سے غیر متعلق حوالوں کی بھرمار، میں کسی ادب پارے کو یا کسی مسئلہ کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں۔ تخلیق میرے نزدیک علم کی نمائش کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ فن کار کی روح کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ میں اپنی شاعری میں بھی اور اپنے مضامین میں بھی انھیں باتوں کا ذکر کرتا ہوں جو میرے دل کو چھوتی ہیں اور شاید اسی لیے یہ چاہتا ہوں کہ پڑھنے والے بھی اس میں شریک ہوں تنقید ہو یا تخلیق جب تک ان میں خود لکھنے والے کے ذہنی، علمی اور احساساتی رویوں کا اظہار نہ ہو، کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ بار بار اپنا حوالہ دینا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے لیکن مجبورا ایسا کرنا پڑتا ہے وجہ یہ کہ میں جو باتیں سوچتا اور محسوس کرتا ہوں وہ اوروں کے پاس ذرا کم کم ہی ملتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ میرے نزدیک محض لفظوں کی تلاش و جستجو زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اگر آپ کی سوچ میں آپ کے احساس میں کوئی ندرت ہے تو آپ کے ذہن میں الفاظ بھی اسی مناسبت سے آئیں گے۔ ندرت یا نئے پن کے معنی کم از کم میرے نزدیک عجیب وغریب صورت حال پیدا کرنے کا نام نہیں ہے۔ سیاہ کے مقابلے میں سفید یا رات کے مقابلے میں دن کا ذکر کر دینا جدت نہیں بچکانہ کھیل ہے۔ اسی طرح کچھ مسلمہ اور رواج پائے ہوئے الفاظ موضوعات اور اسالیب کے بالکل برعکس موضوعات الفاظ اور اسالیب چن لینا کوئی اچھی بات نہیں لگتی۔ کیوں کہ نہ آپ کا ہر تجربہ نیا ہوتا ہے اور نہ ہر لفظ نیا۔ البتہ آپ کا تجربہ یا مشاہدہ اگر سچا ہے تو وہ یقیناً دوسروں سے کہیں نہ کہیں مختلف ہوگا کہ

آپ ان سے کچھ نہ کچھ مختلف ہیں۔ اسی مختلف پن کو پہچاننا اور اپنے فن میں برتنا Genuine فن کار کی پہلی پہچان ہے۔اب طرزِ پیش کش کا مسئلہ سامنے آتا ہے اور شاید یہی سب سے زیادہ مشکل مقام ہوتا ہے کہ وہ اپنی تخلیق میں ہر لفظ اور اظہار یہ بالکل نیا لے آئیں تاکہ لوگوں کو متوجہ بھی کر سکیں اور صاحب طرز بھی کہلائیں۔ یہ جذبہ اچھا ہے لیکن بہت زیادہ احتیاط فن کاری اور مطالعے کا مطالبہ کرتا ہے اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ جدت کے اس شوق میں ہمارے لکھنے والے بے محل الفاظ، دوراز کار استعارے اور معمائی طرز اظہار اختیار کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے مطلب فی بطن متکلم رہ جاتا ہے کیوں کہ لفظ گونگے اور تشبیہ اور استعارے قطعی بے متعلق ہو جاتے ہیں اب رہی نقادوں کی بات سوان کا قصہ یہ ہے کہ ان میں سے بہت سارے کتاب پڑھ کر کتاب لکھنے کے شوقین ہیں۔ کتاب پڑھنا اچھی بات ہے لیکن اسے سمجھ سکنا اس سے زیادہ بہتر ہے کہ اس سے پڑھنے والے کو بھی فائدہ ہوتا ہے اور اس کی تحریر سے گزرنے والے بھی کچھ حاصل کر سکتے ہیں ناموں کی کھتونی بڑا خطرناک عمل ہے۔ کیوں کہ اس میں شاید ہم بہت سوں سے انصاف نہ کر سکیں۔شاید دوستیاں اور آپسی تعلقات آڑے آئیں، اس لیے اسے چھوڑیئے۔

اکرم نقاش : آپ کچھ عرصہ بمبئی میں بھی رہے اور فلموں میں بھی آپ نے کچھ لکھا۔ یہ سلسلہ دراز نہ ہوسکا کیوں؟ تفصیل سے بتائیں؟

بشر نواز : سب سے پہلے تو یہ جان لیجیے کہ میں نے کبھی فلموں میں جانے کی اپنی طرف سے کوئی کوشش نہیں کی۔ بس کچھ مواقع ایسے آئے کہ مجھے کچھ گیت وغیرہ لکھنے پڑے اس میں دلچسپ بات یہ ہے کہ مجھے بمبئی جا کر کسی پروڈیوسر کو مجھ سے گیت لکھوانے پر راضی نہیں کرنا پڑا میں نے اپنا پہلا گیت بھی اورنگ آباد ہی میں رہ کر لکھا۔ ایک فلم بن رہی تھی شنکر خان، جس میں پرتھوی راج کپور دارا سنگھ وغیرہ تھے۔ ان کے پروڈیوسر کو ایک نیشنل song کی ضرورت تھی جو ہندوستان اور چین کی لڑائی کے پس منظر میں ہو سو میں نے ایک گیت بھیج دیا۔ وہ انھیں پسند آیا اور فلم میں لے لیا گیا۔ اس میں صرف یہ بات زیادہ اچھی لگی کہ مجھے پیسے مل گئے او رگیت کو محمد رفیع کی آواز، فلم بازار کے وقت بھی یہی ہوا۔ مجھے

situation دی گئی میں نے گیت بھیج دیا اور وہ ریکارڈ بھی ہوا اور پسند بھی کیا گیا۔ البتہ اس کے بعد دو تین فلمیں ملیں اس وقت میں بمبئی میں اپنے بھائی کے پاس ٹھہرا ہوا تھا سو رہنے سہنے اور کام کرنے کی آسانی ہوگئی۔ اسی اثنا میں کچھ ٹی وی سیریل ملے جیسے امیر خسرو، اورنگ آباد میں بابا صاحب امبیڈکر کی تعلیمی خدمات (ڈاکیومنٹری فلم) اور کچھ غنائیہ فیچرس، اس کے بعد میں پھر اورنگ آباد چلا آیا اور اب تک یہیں ہوں۔ فلموں اور غزلوں وغیرہ کی CDs کے لیے یہیں سے تھوڑا بہت کام کر لیتا ہوں۔

اکرم نقاش : برصغیر کے عصری ادبی منظر نامے کے بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہوں گا۔ تنقید، فکشن اور بالخصوص شاعری کے بارے میں؟

بشر نواز : عصری ادب کا منظر نامہ تو ۵۷، ۵۸ ہی سے ترتیب پانے لگا تھا۔ جب کچھ نئے لکھنے والوں نے ترقی پسندی کی شدت اور بندھے ٹکے ادبی رویوں سے انحراف شروع کیا تھا۔ یہاں ایک بات صاف کر دینی ضروری ہے کہ ترقی پسند ادب میں یہ شدت پسندی بھیونڈی کانفرنس کے بعد زیادہ آئی تھی۔ ورنہ ترقی پسند ادب کی دین سے کوئی سمجھ دار شخص انکار نہیں کر سکتا۔ شاید میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ادب کے بدلتے ہوئے رجحانات کو بڑھانے میں 'صبا' 'سوغات' پاکستان کا 'ادبی دنیا' وغیرہ نے ایک معتدل کردار ادا کیا۔ 'صبا' میں وحید اختر کا مضمون یا سوغات کے اداریے یا مولانا صلاح الدین کے ادبی دنیا میں وزیر آغا اور دوسرے لوگوں کے مضامین ان سب میں بندھی ٹکی سے الگ ہونے کا رجحان تو تھا ہی لیکن اتنی علیحدگی کی کوشش بھی نہیں تھی کہ ادب کی شکل ہی نہ پہچانی جا سکے۔ البتہ اس کے بعد شدت سے تبدیلیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کی بھی کئی وجوہات ہیں جن میں کچھ سیاسی بھی ہیں مثلاً یہ کہ پاکستان کے کچھ لکھنے والے اپنے آپ کو ہندوستان کی روایت سے بالکل الگ کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی تہذیبی اور ثقافتی جڑیں موجودہ پاکستان کی سرزمین ہی میں تلاش کر رہے تھے اس سلسلے میں پہلے تو حسن عسکری اور سلیم احمد وغیرہ نے اسلامی ادب کا نعرہ لگایا جو کچھ چلا و لا نہیں اس کے بعد جڑوں کی تلاش کی بحث شروع ہوئی جس میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ راجا داہر اور اس کے بزرگوں کا تہذیبی ثقافتی سرمایہ ہی سندھ اور پورے

پاکستان کی میراث ہے۔اب یہاں اس بحث کو چھوڑ یے کہ راجا داہر اور مسلمانوں کا کیا تعلق تھا یا حیدرآباد، بہار اور یوپی سے گئے ہوئے مہاجرین کے سلسلے کہاں جا کر ملتے ہیں۔ بہ ہر حال یہ ایک بڑی بحث تھی اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس میں پنجاب کے لکھنے والے خود شامل نہیں تھے۔اسی اثنا میں وہاں کے کچھ نوجوان یورپ اور دوسرے بیرونی ملکوں میں چلنے والی مختلف تحریکوں سے متاثر ہوئے اور خاص طور پر سوسیئر ،دریدا، وغیرہ۔ یہ لوگ زبان کے تفاعل پر غور وخوض کر رہے تھے اور ساختیات پس ساختیات ردساختیات کے مسائل بہر حال کسی نہ کسی صورت میں یہاں کے لکھنے والوں پر بھی اثر انداز ہور ہے تھے۔فرق صرف یہ تھا کہ یہاں کے اکثر لکھنے والے ان تمام مباحث،ان کے نتائج اور ان کے سیاسی اور ثقافتی پس منظر سے قطعی واقف نہیں تھے۔نتیجہ آپ کے سامنے ہے کہ ۶۰، ۶۲ کے بعد سے کچھ لوگوں کی جو تحریریں سامنے آنے لگیں وہ اس قسم کی تھیں کہ ان پر آپ لکھیں اور آپ ہی سمجھیں کی کہاوت صادق آتی تھی۔البتہ یہاں ایک بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ پاکستان میں جو لوگ اس تحریک کو چلانے کے ذمہ دار تھے وہ کچھ دنوں کے بعد پھر اپنی راہ پر آ گئے چنانچہ جیلانی کامران ’پنج سورہ والا‘ اور انور سجاد اپنے تمام تجرباتی افسانے لکھنے کے بعد کونپل جیسے افسانے لکھنے کی طرف مائل ہوئے۔ظاہر ہے کہ یہ افسانہ اور نظم نہ صرف ان لوگوں کی کامیاب تخلیقات ہیں بلکہ اردو کی اچھی تخلیقات میں شامل ہیں۔لیکن کچھ نوجوان لکھنے والے ان تبدیلیوں کو نہیں سمجھ سکے اور وہ تقریباً ۷۰، ۷۵ تک اسی قسم کی ژولیدہ تحریروں کو ادب سمجھ کر خوش ہوتے رہے۔ خیر ۸۰ کے آتے آتے جو نئے لکھنے والے سامنے آئے انھوں نے ان تمام تجربوں وغیرہ سے الگ ہو کر خود اپنے تجربوں اور زبان کی روایت کی روشنی میں اپنا سفر شروع کیا۔جس کے نتیجے کے طور پر سیدھی صاف شستہ اور شفاف زبان میں اپنے مسائل اور اپنی نفسیاتی کیفیات وغیرہ کا اظہار ہونے لگا۔ بیچ کے جو آٹھ دس سال ہیں ان میں میرے اپنے خیال کے مطابق افسانوں کے نام پر کچھ بے ربط اور سمجھ میں نہ آنے والے جملے لکھے جاتے رہے اور نظموں یا غزلوں کے نام پر لکھنو کی انحطاط زدہ شاعری کو اپنے الفاظ میں دہرایا جاتا رہا ہے۔آج آپ دیکھیں تو صرف وہی لکھنے والے اور وہی تخلیقات باقی بچی ہیں جن میں اپنی روایت کا مناسب استعمال بھی ہے زندگی اور اس کے مسائل سے وابستگی بھی ہے اور اس دور پر آشوب میں

فرد کی ذہنی اورنفسیاتی کیفیات بھی اور باقی تمام چیزیں ردی کی ٹوکری کی نذر ہوگئیں۔ آپ شب خون کے لکھنے والوں کے بارے میں پوچھ رہے ہیں تو شب خون، میں جو اس قسم کی چیزیں چھپیں ان کا تو ذکر ہی نہیں ہوتا البتہ شب خون نے جو اچھی تازہ کار اور منفرد انداز کی تخلیقات شائع کیں وہی آج ہمارا سرمایہ ہے۔ اور ۸۰ کے بعد کے آنے والے نوجوان بڑی حد تک انھیں راہوں پر چل رہے ہیں کہ موضوع اور مسائل تازہ ہوں ان کا اظہار مناسب لفظوں اور ہیئتوں میں ہو اور ادب پارے کے رشتے نہ صرف لکھنے والے سے بلکہ قاری سے بھی جڑے رہیں۔ مختصر یہ کہ آج کا ادبی منظر نامہ تجربوں کے نام سے کی جانے والی ہنگامہ آرائی سے پاک ہے۔ تازہ کار ہے۔ جناتی زبان کے بہ جائے انسانوں کی زبان استعمال ہوتی ہے اور اس سے لکھنے والا اور قاری بڑی حد تک مطمئن نظر آتے ہیں کئی نئے شاعر اور افسانہ نگار آج کے جلتے سلگتے مسائل پر پورے خلوص اور ادبی رکھ رکھاؤ کے ساتھ قلم اٹھا رہے ہیں اور آج کا ادبی منظر نامہ انھیں خصوصیات کے حامل لکھنے والوں سے ترتیب پاتا ہے یہاں بھی میں ناموں کی کھتونی کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ کیوں کہ ایسی کھتونیاں اکثر متنازعہ ہوتی ہیں۔

اکرم نقاش : ہمارے شہر کے سب سے زیادہ چھپنے والے افسانہ نگار حمید سہروردی کی ایک عرصہ تک اورنگ آباد اور بیڑ میں سکونت رہی۔ بلاشبہ ان کے افسانے بھی آپ نے پڑھے ہوں گے۔ ان کے افسانوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

بشر نواز : حمید سہروردی کو میں اس زمانے سے جانتا ہوں جب وہ طالب علم تھے اور آج بھی جانتا ہوں جب وہ پروفیسر شپ کر کے رٹائر ہو چکے ہیں ان میں شروع ہی سے ادب اور اپنے اظہار کے تعلق سے بڑی لگن ہے مطالعہ بھی اچھا خاصہ ہے نئے نئے استعارے اور تشبیہات وغیرہ بھی تلاش کر لیتے ہیں۔ البتہ شاید ان کے یہاں کہانی نہیں بنتی جملے اور کچھ اظہارات یقیناً بہت تازہ اور متوجہ کرنے والے ہوتے ہیں لیکن ایک افسانہ نگار کا سب سے بڑا مسئلہ تو افسانہ لکھنا ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی ان صلاحیتوں کے بل بوتے پر یقیناً افسانہ لکھیں گے۔

اکرم نقاش : اورنگ آباد ادبی زرخیزی کے لیے کافی مشہور ہے۔ آپ کے بعد یا آپ کے ساتھ ساتھ لکھنے والوں میں کس کس کے ہاں تخلیقی قوت نظر آتی ہے۔ بے لاگ رائے جاننا چاہتا ہوں کہ آپ دوٹوک کہنے میں باک محسوس نہیں کرتے؟

بشر نواز : اورنگ آباد، یوں تو علم و ادب کے اعتبار سے ہمیشہ ہی جانا پہچانا جاتا رہا ہے لیکن ولی اور سراج اور ان کے ساتھ کے کچھ اور لکھنے والے اردو کے اولین دور میں اورنگ آباد کی پہچان رہے ہیں اس کے بعد کچھ حالات کی تبدیلیوں کی وجہ سے پایہ تخت کے حیدرآباد منتقل ہو جانے کی وجہ سے اور سماجی صورت حال میں تبدیلیوں کی وجہ سے اس فضا میں کچھ کمی بیشی ہوتی رہی۔ مولوی عبدالحق کے اورنگ آباد آنے کے بعد اورنگ آباد کو پھر مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔ یہاں انجمن اردو کا دفتر تھا۔ اردو نامی سہ ماہی رسالہ نکلتا تھا جس میں شاید پہلی مرتبہ تقریظ کے بہ جائے تبصرے شائع ہونے لگے اور تبصرے بھی ایسے کہ کتاب کے سارے عیب و ہنر آئینہ ہو جائیں۔ اس کے علاوہ اردو میں نئے نئے موضوعات پر مضامین شائع ہوئے۔ تحقیق کے نئے پہلو سامنے آئے اور شاعری کے لہجے میں نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ جس کی ایک کامیاب اور مکمل مثال میراجی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ مولوی عبدالحق کے چلے جانے کے بعد یہاں کی ادبی فضا پھر سمٹتی نظر آتی ہے۔ سکندر علی وجد اور شیخ چاند بھی اردو ہی کی دین ہیں۔ ۷۰ کے دہے میں اورنگ آباد کو پھر ایک مرتبہ بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ اس زمانے میں یہاں وہ تمام لوگ جمع تھے جو آج جدید اردو ادب کے اہم دستخط ہیں۔ جوگندر پال، قاضی سلیم، شفیق فاطمہ شعریٰ، فضیل جعفری، پھر ان کے بعد عتیق اللہ اور صادق بھی یہاں آ گئے حمید سہروردی بھی تھے پھر قمر اقبال، جاوید ناصر، شمیم احمد بھی یہاں آ گئے اس طرح یہاں کی ادبی چہل پہل میں ایک نیا خون دوڑنے لگا آج کل بھی ادبی فضا تو بنی ہوئی ہے اور ان میں کچھ باصلاحیت نئے لکھنے والے بھی ہیں جیسے فاروق شمیم، خان شمیم، نورالحسن، صابر، یوسف عثمانی، رعنا حیدری، وغیرہ اسلم مرزا کی زیادہ توجہ تحقیق کی طرف ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر ارتکاز افضل، حمید خان، ڈاکٹر مسرت فردوس، ڈاکٹر صدیق محی الدین جیسے اساتذہ ہیں جنھوں نے کچھ اچھے مضامین اور کتابیں لکھی ہیں۔ ان

کے علاوہ یونیورسٹی اور کالجوں کے طلبہ ہیں جن میں ڈاکٹر ہاجرہ بانو، ڈاکٹر نورالعین، ڈاکٹر فرحین وغیرہ ان لوگوں سے امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

اکرم نقاش : آپ کی دانست میں ہندوستانی ادبی رسائل میں کن کن رسائل نے ادب کی حقیقی ترویج وبقا میں اہم رول ادا کیا۔ سب سے پہلے آپ اپنی تخلیق کس رسالے کو اشاعت کے لیے بھیجنا پسند کرتے تھے؟ یا پسند کرتے ہیں؟

بشر نواز : میرا خیال ہے کہ اوپر اس ضمن میں کئی باتیں آ گئی ہیں۔ تاہم اس پر کچھ بات کر لی جائے۔ پرچے تو بہت سارے نکلے۔ جن میں سے کچھ بہت اچھے تھے لیکن زیادہ دن نہیں چل سکے جیسے حیدرآباد سے 'گجر' کے پانچ سات شمارے نکلے جو بہت عمدہ تھے تعریفیں بھی بہت ہوئیں لیکن تعریف کرنے والے خریدار نہیں بنے نتیجہ یہ بند ہو گیا اسی طرح دلی سے 'فن کار' پرکاش پنڈت نکالتے تھے۔ بڑی تصویروں وغیرہ کے ساتھ اچھی طباعت اور اچھا معیار لیکن اس کا بھی وہی حشر ہوا۔ 'صبا' 'سوغات' 'شب خون' 'کتاب' اور بڑی حد تک 'شاعر' نے ادبی Trend Set کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ بعد میں مغنی تبسم اور شہریار کے 'شعر و حکمت' نے بھی اچھا کام کیا اور بھی کئی پرچے ہوں گے۔ جن کے نام اس وقت ذہن میں نہیں آرہے۔ یہاں میں نے صرف ہندوستانی پرچوں کا ذکر کیا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ میں اپنی تخلیق کس پرچے میں شائع کروانا بہتر سمجھتا ہوں تو اس کا قصہ یہ ہے کہ جس رسالے کا خط آتا ہے اور میرے پاس کوئی تازہ چیز ہوتی ہے تو میں اس رسالے کو بھیج دیتا ہوں۔

اکرم نقاش : ایک آخری سوال کہ آپ نے جو کچھ لکھا اس سے مطمئن ہیں یا عمر کی اس منزل میں کوئی تحریر آپ کے قلم سے نکلنے کو آج بھی بے تاب ہے؟

بشر نواز : میرا خیال ہے کہ کوئی سچا لکھنے والا اپنی تحریر سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوتا۔ البتہ اس کی کوشش ضرور کی جاسکتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ موثر اور بہتر طریقے سے اپنا اظہار کر سکے۔ میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ بہت سی باتیں بہت سے مسئلے،

بہت سے جذبے ابھی ایسے ہیں جو اپنا اظہار چاہتے ہیں پھر زندگی کا معاملہ یہ ہے کہ ہر وقت ایک نئے روپ میں سامنے آتی ہے اور ایک نیا مسئلہ نئی صورت حال درپیش ہوتی ہے ظاہر ہے کہ لکھنے والے کے ذہن میں اس سے عہدہ برآ ہونے کی خواہش تو ہوگی اب یہ بات الگ ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔ ●●

(مطبوعہ تحریرنو۔ممبئی)

(مطبوعہ خبرنامہ شب خون، الہ آباد)

(مطبوعہ غزل کار ہندی، دہلی)

بلراج کومل

نام : بلراج کومل

پیدائش : 28/ستمبر 1928ء

وفات : 2013، دہلی

مصروفیت: ایجوکیشن آفیسر دہلی اڈمنسٹریشن، ممبر دہلی اُردو اکاڈمی، ممبر اڈوائزری بورڈ ساہتیہ اکاڈمی دہلی

تصانیف :
1) میری نظمیں (شاعری)
2) پرندوں بھرا آسمان (شاعری)
3) رشتۂ دل (شاعری)
4) اگلا ورق (شاعری)
5) آنکھیں اور پاؤں (شاعری)
6) ادب کی تلاش (تنقید)

انعامات واعزازات:
1) پدم شری ایوارڈ
2) ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ 1985ء
3) اُتر پردیش اُردو اکاڈمی ایوارڈ 1971ء اور 1982ء
4) سینئر فلوشپ گورنمنٹ آف انڈیا

بلراج کومل سے ایک مکالمہ

اکرم نقاش : آپ کا شمار جدیدیت کے بنیاد گذاروں میں ہوتا ہے۔ جدیدیت کی طرف آپ کے میلان کے اسباب کیا تھے؟

بلراج کومل : میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اپنی پہلی نظم ''اکیلی'' کی اشاعت سے کیا۔ یہ 1948 کی بات ہے جب مجھ پر حادثاً یہ انکشاف ہوا کہ میں شاعر ہوں اور میری پہلی نظم فوری طور پر مقبولیت سے سرفراز ہوئی تو میں وفورِ تخلیق کے عالم میں پہنچ گیا اور میں نے سوچا ہی نہیں کہ میں جدید ہوں یا قدیم یا کچھ اور۔ میں صرف شاعر تھا اور میں شاعری کے تعلق سے فنکارانہ دریافت اور حصول کے سفر پر نکل پڑا۔ 'میرا شمار جدیدیت کے بنیاد گذاروں میں ہوتا ہے'۔ آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ میں اپنے طور پر بہر حال اصطلاحی خانہ بندی سے آغازِ سفر سے لے کر اب تک آزاد رہا۔ اور غیر یقینی حالات اور توقعات کے درمیان اثبات اور توازن کے عارضی مقامات تلاش کرتا رہا۔

اکرم نقاش : اپنے تخلیقی عمل اور تخلیقی سروکار کے بارے میں کھل کر بتائیں؟

بلراج کومل : میں روزمرہ زندگی کے مظاہر اور آس پاس سے گزرنے والے واقعات اور مشاہدات سے اخذ نور کرتا ہوں۔ ہر لحہ عمل اور ردِ عمل کے سلسلے سے گزرتا ہوں۔ غیر پابند انسانی سروکار میری شخصیت کا حصہ ہیں۔ میں نہ نوری ہوں۔ نہ ناری ہوں۔ غیر موافق حالات

سے بھی بنیادی طور پر ہمدردانہ رویوں کے ساتھ گزرتا ہوں۔تخلیقی سروکار انسانی سروکاروں سے جنم لیتے ہیں۔اور دونوں کا رشتہ متواتر اور مسلسل ہے۔

اکرم نقاش : جس وقت آپ نے لکھنا شروع کیا اس دور میں اور آج کے ادبی منظر نامے میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

بلراج کومل : جب میں نے لکھنا شروع کیا اس وقت ترقی پسند ادب کی تحریک اپنے عروج پر تھی۔مینی فیسٹو، اعلان نامہ، اشتہاری مقصدیت، طے شدہ پروگرام، طے شدہ نتائج اور احتساب اس دور کے ادبی منظر نامے کا حصہ تھے۔جو لوگ اس منظر نامے سے الگ رہنے کی کوشش کرتے تھے ان پر کئی قسم کے غیر ادبی، نیم ادبی الزام لگائے جاتے تھے۔آج کا ادبی منظر نامہ ان سب غیر ادبی عناصر سے آزاد ہے۔

اکرم نقاش : آپ نے فکشن لکھا، کبھی کبھار غزلیں بھی کہیں۔لیکن آپ کی شناخت بہ حیثیت نظم گو مسلم ہے۔غزل سے گریز اور نظم سے آپ کی رغبت بیش تر نظم نگاروں کے اس خیال کی ہم رکاب تو نہیں کہ تخلیقی اظہار کے لئے نظم کا دامن غزل کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے؟ تخلیقی قوت کے برخلاف صنف سخن ہی اہم ہوتی تو ہر نظم نگار ن م راشد، میرا جی، اور اختر الایمان کہلاتا۔پچھلے دنوں گلبرگہ میں ہمارے دور کے ایک ذمہ دار نظم نگار جو ایک رسالے کے مدیر بھی ہیں نظم کی تحسین اور غزل کی تنقیص میں یہاں تک کہہ دیا کہ غزل کسی دانشوری اور فکری عمق کی ہرگز متقاضی نہیں اس کے لئے کوئی بہت بڑا ذہن بھی درکار نہیں ہے۔اگر ایسا ہوتا تو میر اور غالب کو کس کھاتے میں ڈالا جائے؟ اس سلسلے میں آپ کیا سوچتے ہیں تفصیل بتائیں؟

بلراج کومل : میں نے نظم، غزل، افسانہ، تنقید، تراجم سب کے ذریعہ اپنی تخلیقی شخصیت کو پیش کیا ہے۔یہ صحیح ہے کہ میری ادبی شناخت حاوی طور پر بطور نظم گو ہے لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ غزل کا دامن نظم کے دامن کے مقابلے میں محدود ہے۔اگر ایسا ہوتا تو صنف غزل میں میر اور غالب کے مرتبے کے بڑے شاعر کیسے پیدا ہوتے۔یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ بہ طور اصناف

سخن نظم اور غزل کے تخلیقی تقاضے ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور کئی طرح سے مختلف ہیں۔ فکشن کا معاملہ، شاعری کے مقابلے میں بطور دائرہ عمل اور بہ طور تخلیقی احوال مختلف ہے۔ میری ترجیحات میں نظم سب سے اوپر ہے لیکن دیگر اصناف سخن اور فکشن کی اہمیت کسی طرح بھی نظم سے کم نہیں ہے۔

اکرم نقاش : ہندو پاک میں آج جو شاعری ہو رہی ہے چاہے غزل ہو کہ نظم آپ کے دور کی شاعری کے مقابلے میں اس ارتقا ہوا ہے یا یہ انحطاط کا شکار ہے یا اس پر جمود طاری ہے؟

بلراج کومل : شاعری چاہے کسی بھی دور کی ہو ارتقا یا انحطاط کی صورتوں کا قطعی طور پر وثوق سے اندازہ کرنا اور پھر اسے الفاظ میں رقم کرنا متعلقہ دور سے کچھ فاصلہ طے ہو جانے کے بعد ہی ممکن ہے۔ صورت حاضر مجموعی طور پر بہر حال جمود کی صورت حال ہرگز نہیں ہے۔

اکرم نقاش : آپ کے دور کے شعرا میں بانی، زیب غوری، قاضی سلیم، شہر یار، باقر مہدی، وحید اختر، عمیق حنفی، منیر نیازی، ظفر اقبال، محمود ایاز، ندا فاضلی، محمد علوی، بشر نواز، افتخار عارف، حمید الماس، وغیرہ کے نام بلا تکلف لیے جا سکتے ہیں۔ آج اس طرح کے نام گنوانے میں کیا آپ وہی آسانی محسوس کرتے ہیں۔ نئی نسل کے نمائندہ شعرا آپ کی فہرست میں کون ہیں؟

بلراج کومل : اردو شاعری کا سفر جاری ہے لیکن آج کے تناظر میں معیار و مرتبہ کے اعتبار سے متفقہ طور پر اہم نام گنوانا آسان نہیں ہے۔

اکرم نقاش : پھر بھی اگر آپ نام گنوانا چاہیں تو وہ نام کونسے ہوں گے؟

بلراج کومل : یہ مشکل امر ہے۔

اکرم نقاش : اظہار کے سانچوں میں کسی بھی طرح کی آسانیوں کی تلاش فن پارے کے حق میں ہوگی؟ پابند نظم سے معریٰ نظم، معریٰ نظم سے آزاد نظم، آزاد نظم سے نثری نظم تک کے سفر کو آپ کس

طرح دیکھتے ہیں؟

بلراج کومل : فن پارے کے معیار حصول اور فنی مرتبے کے تناظر میں اظہار کے سانچے اہم تو ہیں لیکن فیصلہ کن نہیں ہے۔ وہ چاہے پابند نظم ہو یا معریٰ نظم یا آزاد نظم یا نثری نظم وہ سانچے کی آسانی یا مشکل کی وجہ سے اپنا معیار اور مرتبہ نہیں حاصل کرتی۔ بلکہ ان کی کرافٹ اور عملی کارکردگی کے باوجود اس وصف سے معیار اور مرتبہ حاصل کرتی ہے جو خداداد جوہر کے طور پر کسی فن کار کی شخصیت کا حصہ ہوتا ہے اور ماورائے قواعد و قوانین ہوتا ہے۔ لورکا اس وصف اس جوہر کو Duende کہتا ہے۔ سنسکرت شعریات میں یہ رس کے نام سے جانا جاتا ہے۔ عام الفاظ میں اس سطح کی تخلیقی استعداد بہت کم فنکاروں کو عطا ہوتی ہے۔

اکرم نقاش : ادب میں کسی تحریک یا رجحان کی کارفرمائی کا ثبوت اس دور کی تخلیقات میں بہ آسانی تلاش کیا جاسکتا ہے جس طرح ترقی پسند تحریک کے نظریات اور جدیدیت کے خدوخال ان ادوار کی تخلیقات میں روشن ہیں۔ کیا ایسی کوئی نشانیاں موجودہ دور کی تخلیقات میں ڈھونڈی جاسکتی ہیں جن کو پچھلے نشانیوں سے ممیّز کیا جاسکے۔ وہ نشانیاں کیا ہیں جنھیں مابعد جدید کہا جارہا ہے؟

بلراج کومل : ترقی پسند تحریک، جدید یا مابعد جدید رجحانات اردو ادب کے تعلق سے ایک تسلسل کی صورت میں ہیں۔ اب کوئی کسی مینی فیسٹو کا اعلان یا پروگرام یا نعرے کا نام نہیں لیتا۔ اشکال کو اب کوئی ماورائے شناخت حد تک مسخ نہیں کرتا۔ اب کوئی نہ تو زندگی کی بے معنونیت پر اصرار کرتا ہے اور نہ ہی کوئی ادب کے انسانی اور سماجی سروکاروں سے انکار کرتا ہے۔ تجرید کی انتہائی صورتیں اور ترسیل سے بیگانگی کسی کے لئے بھی باعث افتخار نہیں ہیں۔ اصطلاحات کے جبر سے آزادی تازہ ترین ادبی صورت حال کی پہچان ہے۔ اور یہ آزادی ہی بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔

اکرم نقاش : اردو ادب میں ماضی قریب اور حال کے تنقیدی رویوں اور ان کے رول میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

بلراج کومل : اس سوال کا جواب اس سوال سے پہلے والے سوالوں کے جواب میں موجود ہے لہٰذا اسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اکرم نقاش : وہ سوال تو شعری منظرنامے کے حوالے سے تھا۔ خیر۔

اکرم نقاش : یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ تنقید کی حیثیت تخلیق کے مقابلے میں بہرحال ثانوی ہے لیکن کوئی رسالہ اٹھایئے (ایک ادھ استثنائی صورت کو چھوڑ کر) اس کی فہرست میں تنقید اور مضامین پہلے جگہ پاتے ہیں تخلیق بعد میں ایسا کیوں؟

بلراج کومل : ہم سب عادت کے غلام ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کم وبیش عام طور پر وہی کرتا ہے جو دوسرے کرتے ہیں۔ تخلیق اولین حیثیت کی حامل ہے۔ تنقید کی حیثیت ثانوی ہے۔ ہم نے ترجیحات کو گڈمڈ کر کے رکھ دیا ہے۔ ادبی رسائل میں تخلیق کی برتر حیثیت پر پرزور اصرار کرنے کی ضرورت ہے۔

اکرم نقاش : اردو کی موجودہ صورت حال اور اس کا مستقبل کیا آپ کو تشویش میں مبتلا کرتا ہے؟

بلراج کومل : ہندوستان میں اردو زبان کی موجودہ صورت حال یقیناً مجھے تشویش میں مبتلا کرتی ہے۔ کسی بھی زبان کی ترقی اس کے عملی تعلیمی پھیلاؤ پر منحصر ہوتی ہے۔ یونیورسٹیوں میں اردو زبان وادب کے شعبے اپنی جگہ موجود ہیں اور کام کر رہے ہیں لیکن اردو زبان کی تعلیم وترویج کا اسکولی سطح پر دائرۂ عمل سکڑتا جا رہا ہے۔ اگر ہم آرزومند ہیں کہ اردو زبان وادب کے علمی اور تخلیقی سرچشمے قائم ودائم رہیں تو ہمیں اردو زبان کی بنیادی تعلیم وترویج کو یقینی بنانا ہوگا ملک کی تعلیمی تنظیمیں اور اردو اکاڈمیاں اس سلسلے میں بہ حد مقدور جو کام کر رہی ہیں اسے مزید پراثر اور فعال بنانے کی ضرورت ہے۔ ●●

(مطبوعہ اذکار 12۔ستمبر 2009، بنگلور)

خلیل مامون

نام : خلیل الرحمٰن
قلمی نام : خلیل مامون
پیدائش : 27/اگست 1948 بنگلور
تعلیم : ایم اے (فلسفہ)
مصروفے: انڈین پولیس سروسز (1977 بیاچ)
1) انسپکٹر جنرل آف پولیس کے عہدہ سے حسنِ خدمت پر سبک دوشی۔
2) سابق صدر نشین کرناٹک اُردو اکاڈمی بنگلور
3) مدیر رسالہ ''ادب''
4) مدیر اعلیٰ رسالہ ''نیا ادب''
5) مدیر اعلیٰ سہ ماہی ''اذکار'' (دورانِ صدارت)
6) معاون مدیر سہ ماہی ''سوغات''

تصانیف : 1) لسان فلسفے کے آئینہ میں (نثر)
2) نشاطِ غم (شاعری)
3) تاثرات (مضامین)
4) آفاق کی طرف (شاعری)
5) جسم وجاں سے دور (شاعری)
6) بن باس کا جھوٹ (شاعری)
7) سرسوتی کے کنارے (شاعری)
8) سانسوں کے پار (شاعری)
9) اُنیس للہی نظمیں (ترجمہ)

10) محمود ایاز سے گفتگو (انٹرویو)
11) کنڑ اادب (تالیف)
12) کشمیری صوفی شاعری
13) راز امتیاز کی شاعری

انعامات واعزازات: 1) ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ برائے ''آفاق کی طرف''
2) کرناٹک راجیہ اتسو ایوارڈ
3) کرناٹک اُردو اکاڈمی ایوارڈ برائے ''نشاطِ غم''
4) شمس ایوارڈ ہندی اسوسی ایشن بنگلور
5) راشٹریہ سیوا ٹرسٹ ایوارڈ بنگلور
6) مہانگر پالیکے ایوارڈ بنگلور

رابطہ : 09019211001

خلیل مامون سے ایک مکالمہ

اکرم نقاش : ابتداً میں آپ کو اختر الایمان کی طرح خالص نظم گو شاعر سمجھتا تھا۔ بعد میں یہ انکشاف ہوا کہ آپ نے شاعری کی ابتداء غزل سے کی تھی اور اِدھر پچھلے کچھ عرصہ سے آپ کی غزلیں بھی منظرِ عام پر آ ئیں۔ بلکہ غزلوں کا پہلا مجموعہ ''نشاطِ غم'' کچھ سال پہلے شائع ہوا اور اس سال آپ کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ ''سانسوں کے پار'' بھی سامنے آیا۔ غزل سے نظم کی طرف اور پھر نظم سے غزل کی طرف مراجعت کے کیا اسباب ہیں؟

خلیل مامون : کوئی شاعر کسی خاص صنف سے ہی جڑا نہیں ہوتا وہ کسی بھی صنف میں طبع آزمائی کر سکتا ہے۔ کسی بھی شاعر کو کسی خاص صنف سے وابستہ کر کے دیکھنا صحیح نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں نے زیادہ تر نظمیں ہی کہی ہیں اور میری پسندیدہ صنف سخن آزاد نظم ہی ہے لیکن اتفاق سے میری شاعری کی شروعات غزل ہی سے ہوئی ہے۔ (گو کہ اس صنف پر میں سو فی صد دسترس رکھتا ہوں ایسا کوئی گمان مجھے نہیں ہے۔) یہ زمانہ ''نشاطِ غم'' ہی نہیں بلکہ میری سب سے پہلے شائع ہونے والی نظم ''سانحہ'' سے بھی پرانا ہے۔ ''سانحہ'' غالباً 1972 میں ''تحریک'' میں شائع ہوئی تھی۔ اس سے بہت پہلے میری کئی غزلیں روزنامہ ملاپ، دلی میں شائع ہو چکی تھیں۔ اس وقت میں اعزاز تبسم کے نام سے لکھتا تھا اور شمیم کرہانی سے اصلاح لیتا تھا۔ میں نے حقیقتاً 1965ء سے ہی غزلیں کہنا شروع کر دیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں بہ طور اسٹاف آرٹسٹ آل انڈیا ریڈیو دلی سے جڑا تھا۔ اس وقت ریڈیو میں سلام مچھلی شہری کے علاوہ رفعت سروش، پریم ناتھ در اور ساغر نظامی بھی کام

کر رہے تھے۔شروع میں جب میں نے ایک آدھ غزل سلام مچھلی شہری کو دکھائی تو انھوں نے پوری غزل کاٹ کر اک نئی غزل خود لکھ کر دے دی۔ غالبًا اُن کے لیے یہ کام نسبتاً آسان تھا،سلام مچھلی شہری بنیادی طور پر غزل کے شاعر نہیں تھے لیکن ان میں بلا کی موزونیت تھی۔ مجھے یاد ہے کہ لال بہادر شاستری کے انتقال پر اُنھوں نے صرف دو گھنٹوں میں پورا آدھے گھنٹے کا منظوم فیچر لکھ کر دے دیا تھا،اس کے کچھ عرصہ بعد بسمل سعیدی ٹونکی کے ایما پر میں نے شمیم کرہانی سے اصلاح لینی شروع کر دی۔اس دوران نشستوں کے علاوہ میں نے کچھ مشاعرے بھی پڑھے۔نظم نگاری کی طرف میں 1971ء میں متوجہ ہوا۔ ہوا یوں کہ میں بہ ذریعہ ریل دہرہ دون جا رہا تھا اور پرانی دلی ریلوے اسٹیشن پر تھا۔ بک اسٹال میں ''شب خون'' نظر آیا تو خرید لیا۔اس میں شائع کچھ نظمیں پڑھیں تو دل میں یہ خیال آیا کہ اگر فن شاعری یہ ہے تو میں بھی ایسی شاعری کر سکتا ہوں۔اس واقعہ کے بعد میں نے غزلیں کہنا ہی چھوڑ دیا۔ ''نشاطِ غم'' 2000 تا 2001 کے دوران لکھی گئی غزلوں کا مجموعہ ہے۔اس زمانہ میں میں ایک بہت ہی خطرناک قسم کے بحران کا شکار تھا۔اس کو دور کرنے کے لیے رات بھر جاگ جاگ کر میں نے یہ غزلیں کہیں۔لیکن نشاطِ غم کے زمانے تک میری ڈھیر ساری نظمیں جمع ہو گئی تھیں، بہت سے لوگوں کے اصرار کے باوجود میں نے نظموں کا مجموعہ شائع نہیں کیا۔اس کی کوئی واجب وجہ بھی نہیں تھی۔ بالآخر یہ نظمیں ''آفاق کی طرف''میں شائع ہوئیں 2009 میں۔جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں''سانسوں کے پار''میں موجود غزلیں کچھ خاص شعری وجوہ کی بنا پر لکھی گئیں جن کی تفصیل آپ کو''غزل کی نفی میں''مل سکتی ہے۔

اکرم نقاش : ''غزل نیم وحشی صنفِ سخن ہے'' کی بنیاد کلیم الدین احمد نے اس بات پر قائم کی ہے کہ غزل کے شعروں میں ربط نہیں ہوتا، ارتقائے خیال نہیں ہوتا اور غزل میں کوئی مکمل تجربہ بیان نہیں ہوتا جو نظم کی خصوصیت ہے اس لئے وہ غزل کے شعر کو نظم نہیں کہتے۔غزل کے کسی شعر کو نظم نہ کہنا اپنی جگہ لیکن ایک صنف کا مقابلہ دوسری صنف سے کہاں تک مناسب ہے؟

خلیل مامون : کلیم الدین احمد کی یہ بات صحیح ہے کہ غزل کا شعر نظم نہیں ہوتا۔غزل کے شعر کی ہیئت

محض اک عکس کی سی ہے جو اپنی جھلک دکھلا کر غائب ہو جاتا ہے۔ اسے آپ اندھیرے میں جگنو کی چمک سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ شعر کا کوئی عمودی ارتقا نہیں ہوتا۔ شعر کی ہیئت زیادہ سے زیادہ ایک بیان، ایک فقرہ یا ایک مظہر کی سی ہے۔ جو لگتا ہے کہ اس چھوٹے سے مظہر میں کوئی کہانی کوئی داستان پوشیدہ ہو لیکن نظم ایسی نہیں ہوتی۔ شعر ہمیشہ ایک غیر توضیحی قول کے مترادف ہے۔ اس کی ساخت ہی ایسی ہے کہ جو اپنی ہیئت سے بندھا ہوا ہوتا ہے اور اس سے آگے نہیں جا سکتا ہے نہ پیچھے بلکہ نظم مختصر ہوتے ہوئے بھی توضیحی اور توصیفی ہو سکتی ہے۔ جو فرق قول اور تفصیلی بیان میں ہو سکتا ہے وہی فرق نظم اور شعر کا ہے۔ نیز ہر صنف کا فلسفہ الگ ہوتا ہے یہاں فلسفہ سے مراد وہ تعریف اور توضیح ہے جو صنف کی اختراع یا شروعات کے وقت اُسے دی گئی ہو۔ جیسے غزل کے بارے میں یہ بیان کہ یہ معشوق سے گفتگو کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ غزل یا نظم لکھتے وقت لاشعوری سطح پر فلسفہ تو کسی بھی شاعر کے ذہن میں ہونا لازمی ہے لیکن اس کے باوجود دو یا تین مصرعوں کی مختصر نظم کو ہم غزل کے شعر کے ہم پلہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ غزل اور نظم کا موازنہ نہیں کیا جا سکتا، اس لیے موازنہ بڑی حد تک صحیح نہیں ہے۔ ہر صنف کے فنی تقاضے الگ ہیں۔ لہٰذا غزل اور نظم کے شعری و فنی تقاضے بھی الگ ہیں۔

اکرم نقاش : آپ کی بیش تر نظمیں احتجاج طنز اور استہزا کی شدید غمازی کرتی ہیں اس کے برخلاف آپ کی غزلیں اس صورتِ حال سے دو چار نہیں کرتیں جب کہ غزلوں میں ایک زیریں حزنیہ لے اور رومان کو صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے ایک فن کار شاعری ہی کی مختلف اصناف میں اس حد تک مختلف کیوں کر ہو سکتا ہے۔ کیا یہ صنفی تقاضے ہیں، غزل کی روایت کا اثر ہے یا کچھ اور؟

خلیل مامون : یہ صنفی تقاضوں کی وجہ سے بھی ہے اور غزل کی روایت کے اثر کے سبب سے بھی۔ میری نظمیں چوں کہ آزاد ہیں اور میں ان کے اظہار میں آزاد ہوں لہٰذا کسی شعری یا فنی حدود کے تابع نہ ہوتے ہوئے میری نظموں میں احتجاج، استہزا اور طنز کھل کر سامنے آتے ہیں۔ میں اپنے اظہار کو جس سمت چاہے موڑ سکتا ہوں اور جہاں چاہے اُسے مروجہ آہنگ

سے توڑ بھی سکتا ہوں۔اس طرح نظموں میں اپنے غم وغصے کا اظہار میرے لیے آسان ہے۔جب کہ غزلوں میں، میں ردیف، قافیے اور بحر کا اسیر ہوں۔کہیں کہیں تو میرے یہاں جیسے آپ نے اور جبینت پرمار نے اشارہ کیا ہے میری غزل کی بحر بھی بدل جاتی ہے۔''سانسوں کے پار'' میں تو ایک غزل میں مقطع کا قافیہ ہی بدل گیا۔ظاہر ہے ایسی باتوں پر میرے حریف جن کی تعداد بہت زیادہ ہے مجھ پر اور میرے فن پر ہنسیں گے کہ یہ غلطیاں میرے یہاں دانستہ نہیں ہیں۔مجھے لگتا ہے کہ غزل بحر میں ہے لیکن وہ بحر سے اُتر جاتی ہے۔ہوسکتا ہے کہ کچھ بحریں ہی ایسی ہیں کہ جو شاعر کی ''ماتراؤں'' کو پرکھتی ہوں۔اس کے علاوہ میں غزل کی روایت کا بھی قیدی ہوں میں روایت کی حدود توڑ کر باہر نہیں آسکتا۔میرا اظہار ہی کیا ہر کسی کا اظہار بھی غزل میں محدود ہے۔نظم کی صنف جو آزادی مجھے دیتی ہے وہ غزل نہیں دیتی۔میرے لیے میری نظم میری شخصیت اور ذات کی توسیع کے مترادف بھی ہے۔بڑی حد تک یہ بات ہر شاعر پر صادق آتی ہے۔شاعر کوئی دست کار نہیں ہے کہ جو اپنی صناعی سے اپنی ذات سے الگ ہوکر مورتیاں بنائے۔کبھی شری گنیش جی کی تو کبھی عیسیٰ مسیح اور کبھی شیر اور بکری کی یکسانیت ،ذات وصفات کی یکسانیت تاہم آپ 'آفاق کی طرف' سے لے 'کر سرسوتی کے کنارے' تک کی نظموں کا مطالعہ کریں تو آپ کی بات صحیح نہیں معلوم ہوگی۔''جسم وجاں سے دور'' کی نظمیں الگ ہیں۔جیسے ''میں گواہی دیتا ہوں''،''عمرِ عزیز گنوا کر''،''وہ عورت''،''اُردو بازار'' وغیرہ اسی طرح ''بن باس کا جھوٹ میں''،''میں آرہا ہوں''،''وہ''،''کچرا ڈھونے والی گاڑی''،''ڈنی کی موت پر''،''ایک بے کار نظم'' وغیرہ اسی طرح ''سرسوتی کے کنارے میں''،''دلی جو ایک شہر تھا''،''کتے''،''نیا راستہ''،''سمراٹ اشوک کا گیت''،''دفاع''،''محمود غزنوی کے نام'' وغیرہ وغیرہ۔یہ نظمیں بالکل اس طرح سے الگ ہیں جیسے میں آج سے 30 سال قبل یا آج سے ایک ماہ پہلے الگ تھا۔میری زندگی وہ نہیں ہے جو کل تھی اور نہ آئندہ یکساں رہے گی۔میں ،میرے احساسات،میرے خیالات اور میری فکر اور میرے اطراف کی اور پھر اندر کی دنیا مستقل طور پر تغیر پذیر ہیں۔اسی لیے میرے موضوعات میں بے انتہا تنوع ہے کیوں کہ میں نظم لکھتے ہوئے صرف لفظی بازی گری نہیں کر رہا ہوتا ہوں لہٰذا میری نظموں میں یکسانیت کا الزام میرے

نزدیک ایک سطحی مشاہدہ ہے۔میرے نزدیک کسی بھی شاعر کے ہاں ہیئت اور مواد کی یکسانیت صحیح نہیں ہے۔اسلوب کی یکسانیت اس اعتبار سے صحیح ہے کہ اسلوب شخصی اظہار کا حصہ ہے یہ بات کسی بھی بڑے شاعر کے یہاں دیکھی جاسکتی ہے مثلاً میر،غالب،اقبال اور ہمارے زمانے میں میراجی،راشد،فیض،ناصر کاظمی اور ظفر اقبال کی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔آپ کسی ایک کا شعر یا نظم پڑھیے میں بتادوں گا کہ کس کی نظم یا کس کا شعر ہے۔کیا آپ اسے یکسانیت کہیں گے۔نہیں،یہ شخصیت کا پرتو ہے جو کسی ایک شاعر کی شناخت میں معاون ثابت ہوتا ہے۔میں نے کوئی بھی نظم کسی الگ ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کے بغیر نہیں کہی ہے۔لہٰذا یکسانیت کی بات صحیح نہیں ہے۔

اکرم نقاش : میں نے آپ کے سلسلے میں صرف ہیئت،اسلوب اور لہجے میں یکسانیت کی بات کہی ہے۔موضوع اور مواد کا سوال عمومی ہے۔خیر۔

اکرم نقاش : غزل کے شاعر کے لیے پابند نظم معریٰ وآزاد نظم کہنا کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن آزاد نظم کے مقابلے میں آپ نے نثری نظمیں زیادہ لکھی ہیں۔نثری نظم کے بارے میں آپ کے تاثرات جاننا چاہوں گا؟

خلیل مامون : میں نے ''آفاق کی طرف'' تک آزاد نظمیں ہی کہی ہیں مطلب ایسی نظمیں جو کسی نہ کسی بحر میں ہوں۔اس مجموعہ میں نثری نظمیں بہت ہی کم ہیں۔میری نثری نظموں کا سلسلہ''جسم وجاں سے دور'' سے شروع ہوتا ہے جس طرح غزل میں شاعر ردیف وقوافی اور بحر کا شکار ہوتا ہے اُسی طرح آزاد نظم میں بھی شاعر بحر کا پابند ہوکر رہ جاتا ہے اور اُسے اظہار کی کلی آزادی نہیں ملتی۔چوں کہ آزاد نظمیں بحر میں لکھی جاتی ہیں اس پر اس بحر کے ذریعہ روایت کی گرفت بھی ہوتی ہے اور اس میں شاعر اکثر بحر کے بہاؤ ہی میں اپنے اظہار کو تشکیل دے سکتا ہے جو الفاظ بحر میں وزن میں نہ آسکے اور اظہار نہ پاسکے یہ سمجھئے کہ وہ خیالات بے کار گئے اور اس طرح شاعر بحر کے گھوڑے پر سوار بھاگتا رہتا ہے جہاں گھوڑا رکا وہیں نظم ختم ہوئی۔ہمارے یہاں نئی نظم اس اعتبار سے غزل ہی کی توسیع نظر آتی ہے۔ن۔م۔راشد کی شاعری اسی طرح کی ہے۔مواد کے اعتبار سے اہم ہوتے ہوئے

بھی میں راشد کی نظموں کو نئی شاعری کی بہترین مثالیں تصور نہیں کرتا، راشد کی شاعری میں اُس کا بلند آہنگ اور اظہار ہی اسے مقبول بناتا ہے جو اُن کے ہاں اقبال سے آیا ہے۔ نثری نظم شاعر سے کسی پابندی کا تقاضا نہیں کرتی۔سوائے ایک اندرونی اور بیرونی آہنگ کے اور شاعر کسی بھی نظم کی تخلیق میں بڑی حد تک آزاد رہتا ہے۔''آفاق کی طرف'' کے بعد میں نے محسوس کیا کہ آزاد شاعری کے لیے بحور سے آزادی بہت ضروری ہے۔لہٰذا میں نے نثری نظمیں لکھنا شروع کیں۔ یہ کام میں نے آسانی کے لیے نہیں کیا بلکہ اس شعری ضرورت کو سامنے رکھ کر کیا کہ یہاں میں اپنے آزادانہ اظہار کا تانا بانا بننے کے لیے آزاد ہوں۔ میری نظر میں اچھی نثری نظم لکھنا کوئی اچھی غزل لکھنے سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج بھی بہت کم لوگ اس صنف کی طرف مائل ہیں۔لوگ شاعری کو موسیقی کے آہنگ ہی میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

اکرم نقاش : آپ کا بنیادی ادبی سروکار شاعری ہے لیکن آپ نے نثر کی طرف بھی توجہ کی ہے۔''لسان فلسفے کے آئینے میں'' آپ کی کتاب اس وقت منظرِ عام پر آئی جب لسانیات کو فلسفہ کی نظر سے دیکھنے کی مثال ہندوستان میں شاید نہیں تھی۔آپ نے مختلف کتابوں پر تبصرے بھی کیے ہیں۔آپ کے تبصرے معیاری ادب کا تقاضہ کرتے نظر آتے ہیں۔ان تبصروں میں اچھے فن پاروں کی طلب کی دردمندی بھی محسوس کی جاسکتی ہے لیکن ان تبصروں کا لہجہ بڑا درشت اور جارحانہ لگتا ہے۔اعتراضات تاثراتی زیادہ ہیں مدلل اور تجزیاتی کم۔کیا ہر فن کار اور ہر کتاب سے شاہ کار کے تقاضے مناسب ہیں؟

خلیل مامون : ہر کتاب سے شاہ کار کا تقاضا کرنا نہ صرف یہ کہ نامناسب ہے بلکہ صحیح بھی نہیں ہے۔ میرے تبصروں میں موجود جس شدت پسندی کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہ صحیح ہے لیکن میں نے کسی بھی تبصرہ یا مضمون میں کسی شاہ کار کی توقع کا اظہار نہیں کیا ہے۔ میں نے صرف بنیادی باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میری تنقید کی تحریر ناپ تول کی تحریر نہیں ہے۔ یہ کام تو بہت سے نقادوں نے کیا ہے۔ میں کوئی پیشہ ور نقاد بھی نہیں ہوں اور اگر میری تنقید تاثراتی ہے تو اس میں برائی کیا ہے۔ یہ عمل عروض کے پیمانوں پر تقطیع کا عمل

نہیں ہے کہ میں یہ بتاؤں کہ کہاں کون سا لفظ گرتا ہے یا زیادہ ابھرتا ہے۔میری تنقید یا تبصرہ کا جو ہر میرا تاثر ہے تو اس میں غلط بات کیا ہے۔ میں اپنے وجدان وعرفان سے اشیا کو سمجھتا ہوں۔ادب تو محسوس ہی کیا جانے والا معاملہ ہے اچھا محسوس ہوا تو میں نے اچھا کہا، برا محسوس ہوا تو میں نے برا کہا۔صحیح یا غلط قرار دینا اسی احساس سے جڑا ہوا عمل ہے۔ ہر فن کار اور ہر کتاب سے شاہ کار کا تقاضا نہیں ہے۔ بلکہ ہر ایک سے اتنا مطالبہ ضرور ہے کہ وہ ادب کے بنیادی تقاضے ضرور پورا کرے۔کوئی الف، ب، ت میں ہو تو اسے یہ بتانا کیا شدت پسندی ہے۔ویسے یہاں میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ شدت پسندی ہی نہیں درشتگی بھی میری شخصیت کا حصہ ہے۔علمِ نجوم کے مطابق میری شخصیت میں ایک عنصر ہے جسے ''وبا گھٹا'' کہا جاتا ہے میری بات میں ہزار نیک نیتی ہو لیکن سننے والا اُسے درشت اور سخت ہی کہے گا ممکن ہے کہ یہ عنصر ہی ادب کے ''دادا ازم'' کی ہی کوئی چھوٹی موٹی صورت ہو۔ یہ ہر حال مجموعی طور پر اگر نئے لکھنے والوں کو یہ نہ بتایا جائے کہ وہ جو کر رہے ہیں وہ صحیح نہیں ہے وہ آگے چل کر اچھے ادیب کیسے بنیں گے اور شاہ کار ادب کیسے پیدا کریں گے۔خصوصاً ایسے ماحول میں جب صحیح اور غلط کی تمیز ہی مٹ گئی ہو اور جو کچھ لکھا جاتا ہے چھپ جاتا ہے۔ میں آج شائع ہونے والے کئی پرچوں میں شائع ہونے والی تخلیقات کی جانب آپ کی توجہ ،مبذول کرا سکتا ہوں کہ جن کا سر پیر کچھ بھی نہیں ہے۔معیار اور اسلوب تو سب دور کی باتیں ہیں۔ یہ باتیں آج کے ادب کے کاروبار کا حصہ ہیں جہاں رسالہ کی مارکیٹنگ اہم ہے جس کے پیش نظر مدیروں نے کوئی معیار برقرار ہی نہیں رکھا ہے۔

اکرم نقاش : آپ محکمۂ پولس کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے صحافت سے بھی آپ کا تعلق رہا اور ادبی صحافت سے بھی آپ کی دل چسپی آپ کے جاری کردہ رسالوں سے ظاہر ہے آپ نے انگریزی میں بھی ایک رسالہ جاری کیا تھا لیکن یہ سب سلسلے مستقل نہیں ہو پائے اور ان میں تواتر کی بھی کمی رہی ایسا کیوں؟

خلیل مامون : پولس کی نوکری میری معاشی مجبوری تھی لیکن اس مجبوری کے باوجود میں نے اپنی نوکری

کے دوران دو بار حکومت کو اپنا استعفیٰ روانہ کر دیا تھا۔ پہلی مرتبہ 1998 میں جب حکومت نے ترقی دے کر مجھے ڈی۔آئی۔جی (انتظامیہ) مقرر کیا۔ پھر میرے ڈی۔جی نے مجھ پر یہ حکم صادر کیا کہ میں آسامی کا چارج نہیں لے سکتا۔ یہ آسامی خاصی اہم اس وجہ سے تھی کہ اس میں پولس کے بڑے عہدوں یعنی انسپکٹر سے لے کر آئی۔جی۔پی اور ڈی۔جی۔پی کا تقرر ہوتا تھا۔ نیز تمام خفیہ معاملات یعنی افسروں کی سالانہ رپورٹ وغیرہ سے اس کا تعلق تھا، جب میں نے اس پر احتجاج ظاہر کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا تو محکمہ میں تہلکہ مچ گیا اور میرے ایک آئی۔جی۔پی دوست نے جن کا نام ثرت سکسینہ ہے۔ بیچ بچاؤ کر مجھے سمجھا بجھا کر استعفیٰ واپس لینے پر مجبور کیا اور مجھے اس عہدہ کا چارج لینے کی اجازت دی گئی۔ میں نے اس عہدہ پر 10 دن کام کیا اس کے بعد مجھے ڈی۔آئی۔جی (صدر دفتر) کا حکم نامہ دیا گیا۔ یہ آسامی بھی اہم تھی مگر اتنی نہیں جتنی پہلی والی۔ اس کے بعد پھر جب میری ترقی کی باری آئی تو ڈی۔جی نے پھر میری مخالفت کی اور میں نے استعفیٰ دے دیا۔ اس بار میرا استعفیٰ قبول ہونے کو تھا کہ میرے اڈیشنل ڈی۔جی جناب بورکر کے اصرار پر واپس لینا پڑا۔ یہی حال رسالوں کا ہے اس میں تجربی مشکلات بھی ہیں ہمارا نظام بھی ہے کہ جس میں کوئی آدمی آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں کام کرنے کے لیے تیار نہیں۔ سب پکی پکائی روٹیاں کھانا چاہتے ہیں۔ مجلسِ ادارت میں اپنا نام چاہتے ہیں کوئی نہ کام کرنا چاہتا ہے نہ ہی اشتہارات کی صورت میں کوئی مدد فراہم کرنا چاہتا ہے۔ میں ایک بار غفار شکیل کی چیرمین شپ کے زمانے میں اُردو اکادمی سے احتجاج کرتے ہوئے مستعفی ہو چکا ہوں۔ اسی طرح قومی کونسل برائے فروغ اُردو اور مرکزی ساہتیہ اکادمی کی مشاورتی کمیٹی سے بھی۔ میں زندگی اپنی من مرضی سے ہی جیا ہوں کوئی چیز کبھی پسند آتی ہے لیکن اندرونِ خانہ بڑی بھیانک صورتیں اُبھرتی ہیں تو جی اُچٹ جاتا ہے اور میں ایسے لوگوں سے اور ایسے اداروں سے الگ ہو جاتا ہوں۔ میں تو سکہ بند نظریات اور اعمال اور Compromise کا عادی نہیں ہوں۔ میں اس بارے میں بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں۔

اکرم نقاش : آپ محمود ایاز کے بہت قریبی احباب میں شمار کئے جاتے ہیں آپ ''سوغات'' کے

معاون بھی رہے آپ نے کہیں لکھا ہے کہ محمود ایاز سے آپ کے تعلقات کی نوعیت Love and Hate کی سی رہی ہے ان سے آپ کی چاہت کی وجوہات کیا تھیں اور ان سے گریزاں رہنے کے اسباب کیا تھے؟

خلیل مامون : یہ کہنا کہ مجھے محمود ایاز سے چاہت تھی سوفی صد صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ محمود ایاز کتنے ہی اچھے ادیب کیوں نہ ہوں کاروباری آدمی تھے اس کے علاوہ اپنے اور اپنے خاندان والوں کے آگے کسی کو کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ یہ بات میں اُن کے بیانات کے آئینہ میں کہہ رہا ہوں۔ مثال کے طور پر ایک بار انھوں نے خلیل الرحمٰن اعظمی کو بیٹے کے لیے لکھی گئی ایک بہت اچھی نظم سنائی اور اُس کے بعد کہا نہ جانے اب وہ بیٹا کہاں پڑا ہوگا۔ کئی بار اپنے کچھ دوستوں کے بارے میں جو بلانوش تھے بات کی اور کہا دیکھو وہ اب کہاں پڑے ہیں۔ (قبر کی طرف اشارہ) میں دیکھو احتیاط کرتا ہوں۔ اُنھیں ایک طرح سے اپنی عقل وفہم پر بے جا ناز تھا۔ لیکن قدرت نے انھیں ایسی جگہ پکڑا جہاں سے وہ پلٹ کے آنہ سکے۔ یہ سب باتیں مجھے پسند نہیں تھیں۔ اس کے علاوہ سالار میں ملازمت کے دوران اُنھیں میں بھگت چکا تھا۔ وہاں ہمارے تعلقات مالک اور نوکر ہی کے تھے۔ چوں کہ سوغات اچھا رسالہ تھا میں نے اور عزیز اللہ بیگ نے ان پر زور ڈالا کہ وہ سوغات نکالیں۔ سوغات کے تیسرے دور میں رسالہ کے لیے سارے کے سارے اشتہار میری کوششوں سے ملے۔ ہر ہفتہ محمود ایاز ہمیں کھانے پر بلایا کرتے تھے، قربت کی بس یہی اک وجہ تھی۔

اکرم نقاش : محمود ایاز ایک کامیاب مدیر اچھے شاعر اور صاحبِ نظر نقاد تھے مجموعی طور پر آپ محمود ایاز کی شخصیت کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کے ادبی نظریات اور ان کی فکر کے بارے میں آپ کیا سوچتے ہیں؟

خلیل مامون : محمود ایاز ایک بہت ہی اچھے مدیر اور صاحبِ نظر آدمی تھے۔ میں انھیں نقاد نہیں کہوں گا لیکن زندگی اور ادب کا اُن کا مطالعہ بہت اچھا تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہندو پاک

کے لکھنے والوں میں ان جیسا دیانت دار آدمی آپ کو ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔ میں اُنھیں اوسط درجہ کا شاعر تصور کرتا ہوں۔شاید اسی لیے اُن کے مجموعہ کلام ''نقش برآب'' کی پذیرائی نہیں ہوئی وہ ایک کلاسیکی ذہن رکھتے تھےلیکن ادب میں تغیر وتبدل کے خلاف نہیں تھے۔فن پاروں کی جانچ میں اُن کا ذہن غیر متعصب تھااور یہ ہمارے آج کے ادب میں بڑی بات ہے۔اُنھوں نے ادب کے بل بوتے پرسرکار سے یا قارئین سے کوئی ناجائز مطالبہ نہیں کیا نہ ہی اپنی شخصیت کے فروغ کے لیے اُردو اکادمی کو استعمال کیا جس کے وہ تین بار صدر رہ چکے تھے۔کئی پبلشنگ گھروں سے بارہا اصرار کے باوجود انھوں نے اپنا مجموعہ نہیں چھپوایا۔محض اس وجہ سے کہ وہ ان لوگوں سے کتابیں اکادمی کے لیے خریدتے ہیں۔اُن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو 9 برسوں میں ان کی کم از کم 20 کتابیں تو چھپ گئی ہوتیں۔وہ مجھے بے حد چاہتے تھےلیکن اُن کی موت سے تقریباً ایک سال پہلے ڈرامہ کے تعلق سے میرے اور اُن کے درمیان تلخی پیدا ہوگئی اور میں نے تعلقات منقطع کردیے۔لیکن جب اُنھیں کینسر تشخیص ہوا تو انھوں نے مجھے کہلا بھیجا اور میں اُن سے ملنے اسپتال گیا اور یہ سلسلہ اُن کی موت تک جاری رہا۔

اکرم نقاش : ایک بہت ہی شخصی سوال کہ آج بیش تر لوگ compromise کو زندگی کی اہم قدر مانتے ہیں اور کچھ لوگ اس کے برخلاف سوچتے ہیں لیکن موخرالذکر کی مثالیں کم ہیں۔ شخصی طور پر میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ لوگوں سے آپ کے مراسم دیرپا نہیں رہ پاتے۔کوئی شخص اچانک آپ سے بے حد قریب ہوجاتا ہے اور اسی رفتار سے منظر سے غائب بھی ہو جاتا ہے ایسا کیوں؟

خلیل مامون : زندگی میں رشتوں ناطوں،دوستی اور میل ملاپ کا انحصار باہمی یقین اور محبت پر ہوتا ہے۔جب آپ کسی سے محبت کرتے ہیں تو اُس کی تمام تر اچھائیوں اور برائیوں کو تسلیم کرکے اُس سے محبت کرتے ہیں۔میرے یہاں دوستی اور میل ملاپ بھی اسی کسوٹی پر پرکھے جاتے ہیں۔میں اپنا مطلب نکال کر کسی کو اپنے سے دور نہیں کرتا بلکہ جب دوسروں کی نیتوں میں کھوٹ دیکھتا ہوں تبھی اُن سے کنارہ کش ہوجاتا ہوں اور اُن سے رسمی گفتگو

اور بات چیت بھی بند کر دیتا ہوں۔ میں چائے خانے یا کافی ہاؤز کی دوستی کا قائل نہیں ہوں۔ میں پہلے یہ مانتا تھا کہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے لیکن آج سوچتا ہوں کہ یہ سب باتیں بکواس ہیں۔ دنیا اور ہمارے سماج میں میل ملاپ، دوستی، پیار محبت، سبھی کا دارومدار روپئے پیسے اور اثر ورسوخ سے ہے محبت اور معیار کی کوئی قدر نہیں ہے۔ آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ آج میرا کوئی دوست تو دور کی بات ہے ملنے والا بھی نہیں ہے اور اس طرح میں ہر تعلق سے آزاد ہوں۔ کچھ تعلقات مرتے دم تک نبھانے پڑتے ہیں سو نبھا رہا ہوں۔

اکرم نقاش : قلندری بے نیازی اور دنیا داری دو متضاد صفات ہیں میری آنکھیں اس خلیل مامون کو بھی دیکھتی ہیں جو دنیا کی رفتار و تقاضوں سے ہم آہنگ ہے اور میں اس خلیل مامون کو بھی دیکھتا ہوں جو قلندر صفت معصومیت سے بھر پور اور دنیا کی چکا چوند و کشش سے بے نیاز ہے ۔کیا آپ میرے اس خیال سے اتفاق کریں گے؟

خلیل مامون : آپ کا یہ مفروضہ کہ میں دنیا کی رفتار اور تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں صحیح نہیں ہے۔ ممکن ہے دیکھنے والوں کو ایسا لگتا ہوگا کہ میں ہم آہنگ ہوں۔ ایسا نہیں ہے اگر اتفاق سے کہیں پھنس بھی جاؤں تو بہت جلد اپنے گلے سے پھندہ نکال کر پھینکتا ہوں میں بڑی حد تک دنیا اور اُس کے معاملات سے بے نیاز ہوں لیکن آپ جانتے ہوں گے کہ بشریت کے تقاضوں سے کوئی سوفی صد بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اس کا مجھے قلق ہے۔ ہمیشہ مجھے یہ افسوس ہوتا ہے کہ ایسی زندگی گزارنی پڑ رہی ہے کہ یہاں کئی چیزوں کا انحصار دوسروں کے فیصلہ جات اور دوسروں کے واسطہ پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے انسان کی بے بسی پر بھی ترس آتا ہے۔ یہ دیکھ کر سب فلسفے سب مذاہب اور سب علوم بے کار معلوم ہوتے ہیں۔

اکرم نقاش : اپنی پبلیکیشنز کے تحت میں نے آپ کی دو کتابیں شائع کی ہیں۔ کتاب کی کمپوزنگ کے دوران بھی آپ نے کئی نئی نظمیں مجھے بھجوائیں ادھر بہت قلیل وقت میں بہت زیادہ غزلیں (جن کی تعداد سینکڑوں میں ہے) آپ نے کہی ہیں لکھنے کی اس رفتار کے اسباب

وہ عوامل کیا ہیں؟ کیا آپ کی نظمیں ایک ہی نشست میں مکمل ہو جاتی ہیں یا مختلف نشستوں میں؟ آپ کے تخلیقی عمل کے بارے میں جاننا چاہوں گا؟

خلیل مامون : میری لکھنے کی رفتار میری بے کاری اور میری بے زاری سے جڑی ہوئی ہے۔ جب تک مجھے نیند نہ آجائے مجھے کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی عادت ہے۔ میں بے کار نہیں بیٹھ سکتا۔ وظیفہ یابی کے بعد میرے پاس کوئی کام نہیں۔ گو کہ میرا تھوڑا بہت وقت باغ بانی، زیبائش، مچھلیوں کی پرورش اور دیکھ بھال اور کتے کی دیکھ ریکھ میں اور روزمرہ کے کاموں میں نکل جاتا ہے لیکن اس کے باوجود میرے پاس کچھ کرنے کے لیے بہت سارا وقت بچ رہتا ہے اس خلا کو پر کرنے کے لیے پڑھتا لکھتا رہتا ہوں۔ پڑھتا کم ہوں لکھتا زیادہ ہوں۔ میرے لیے تخلیقی عمل ہمیشہ سے بہ قول غالب:

؎ غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

کے مصداق رہا ہے۔ میری اکثر نظمیں یا غزلیں ایک ہی نشست میں پوری ہو جاتی ہیں۔ اُنھیں نظرِ ثانی کے بعد دوبارہ لکھتا ہوں۔ میری کوئی بھی تخلیق ایک سے زائد نشستوں میں پوری نہیں ہوتی۔ خیالات کیسے آتے ہیں نظم کا اظہار لفظوں میں کس طرح آتا ہے یہ میں آج تک سمجھ نہیں پایا۔ ایک زمانہ تھا جب مجھے نظمیں خواب کی صورت میں دکھتی تھیں۔ مثال کے طور پر ایک نظم جس کا مجھے اب صرف ایک مصرعہ یاد ہے خواب میں ایک خاتون نے سنائی تھی۔ اُس کا پہلا مصرعہ یوں تھا:

ع رات نیزے کی طرح سینے میں پیوست ہوئی

میں نے صبح اُٹھ کر پوری نظم لکھ بھی لی تھی۔ لیکن اسے کہیں چھپنے کے لیے نہیں بھیجا۔ بعد میں وہ کہیں کھو گئی اب صرف ایک مصرعہ یاد ہے۔ یہ بات غالباً 1972 یا 1973 کی ہے۔ میرے لکھنے کا عمل لاشعوری زیادہ ہے۔ شعوری کوشش سے میں کچھ نہیں لکھ سکتا۔

اکرم نقاش : پچھلے دنوں آپ کی ایک نظم ''بے نام'' موضوعِ بحث رہی بلکہ اعتراضات کا شکار رہی، یہ نظم طنز سے مملو ہے اس کا لہجہ اور طرزِ بیان دُرشت ہے جو ایک عام قاری کے لیے قابلِ قبول نہیں لگتا اور یہ نظم ایک ایسے مسلمان کا تقاضہ کرتی ہے جو ریا کار نہ ہو اس کے قول و فعل

میں تضاد نہ ہو جو دین کا صحیح شعور رکھنے والا ہو مختصراً اگر کہا جائے تو وہ ایک آئیڈیل مسلمان ہو بلکہ مومن ہو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ سارے کے سارے مسلمان اس طرح مصفا و نیک طینت ہو جائیں بشری تقاضے بھی تو ہوتے ہیں کیا یہ انتہا پسندانہ تقاضہ نہیں ہے۔ کیا اللہ کے لیے ہر شخص کو مومن بنانا مشکل کام تھا؟

خلیل مامون : نظم ''بے نام'' کسی مسلمان سے کوئی تقاضا نہیں کرتی۔ کسی شاعر کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو ہندو یا مسلمان بننے کی تلقین کرتا پھرے۔ کوئی بھی ادیب یا شاعر مسلمان یا ہندو بن کر کوئی تخلیق نہیں کر سکتا۔ گو کہ اُس کے عقائد اُس کی تخلیقات کے پس منظر میں ہوتے ہیں۔ میری نظر میں کوئی صحیح شاعر یا ادیب مذہب و ملک سے بلند ہو کر ہی کوئی ادب تخلیق کر سکتا ہے۔ کوئی بھی نظم لکھتے ہوئے میری صورتِ حال یہی تھی۔ نظم مجموعی طور پر مسلمان عوام کی بے بسی کو ظاہر کرتی ہے۔ اسی بے بسی کے نتیجہ میں شاعر آخر میں کوڑا کرکٹ کے ڈھیر میں جلا کر مار دیے جانے کی آرزو کرتا ہے، میرے لیے اسلامی اساطیر جن کا کہ نظم میں حوالہ ہے ایسے اساطیر ہیں جو آج کے انسان کے لیے بے معنی ہیں۔ میرے نزدیک روایت سے بغاوت ہر اچھے ادب کا حصہ ہے۔ پر اس نظم میں بغاوت نہیں ہے۔ یہاں شاعر اپنے آپ کو ان اساطیر سے جدا کر کے اپنی شناخت بنا رہا ہے۔ یہ ایک سچی کیفیت کی عکاسی ہے۔ نظم کسی مسلمان یا مومن سے بڑی نہیں ہے۔ اللہ کس کو کیا بنا سکتا ہے کلیتاً غیر ادبی بات ہے۔ نظم کو اس کے پس منظر میں پرکھنا چاہئے نہ کسی مذہب یا ملک کے آئینہ میں۔

اکرم نقاش : میں نے بغاوت کا ذکر نہیں کیا ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ سارے کے سارے مسلمان دین کے بنیادی تقاضوں سے متصف ہو جائیں۔ کیا یہ ممکن ہے؟ خیر اگلا سوال۔

اکرم نقاش : ''ن۔م۔ راشد اور میراجی کے مکتبۂ خیال کے ناقدین کا کہنا کہ فیض کی شاعری کا مزاج سراسر رومانوی ہے زندگی کے بنیادی جذبے مثلاً: غصہ، نفرت، حقارت اور خوف کا اظہار فیض کی شاعری میں نہیں ہوا ہے۔ فیض کے ہاں صرف چیزوں کو Beautify کرنے کا عمل ملتا ہے اور یوں فیض کی شاعری کا کینوس بہت محدود ہے جب کہ مقبولیت کے اعتبار

سے فیض اقبال کے بعد سب سے بڑا نام ہے''۔اس اعتراض کے جواب میں فیض صاحب نے کہا تھا کہ''راشد کی شاعری کا کینوس کون سا بڑا ہے۔ان کی شاعری میں سوائے ان کی ذات اور لاشعور کے ہے کیا؟اور میرا جی گیتوں کے شاعر ہیں اس کے علاوہ ان کی شاعری کا کوئی Content نہیں ہے''۔مذکورہ دونوں باتوں کے سلسلے میں آپ کی رائے جاننا چاہوں گا کہ راشد اور میرا جی آپ کے پسندیدہ شعراء میں ہیں۔(مذکورہ بالا باتیں فیض صاحب کے ایک انٹرویو سے مقتبس ہیں)؟

خلیل مامون : فیض کی شاعری کے بارے میں جو کچھ ناقدین نے کہا ہے وہ بڑی حد تک صحیح ہے کیوں کہ میری نظر میں فیض کی شاعری رومانی ہے اور وہ فارسی کے چند شعرا اور غالب کی لفظیات کو استعمال کر کے شعر کہتے ہیں۔ممکن ہے یہ عمل اُن کے ہاں لاشعوری ہو۔اُن کی شاعری میں بہت کم ایسا ہے کہ جو یاد رکھا جائے گا۔غزلوں کے لگ بھگ 25 تا 50 اشعار اور چند نظمیں۔اُن کی شاعری کا کینوس بے حد محدود ہے۔مقبولیت اور اچھے ادب کا کوئی چولی دامن کا ساتھ نہیں۔اقبال کی شہرت اُن کی شاعری کا اسلام سے تعلق تھا۔اور فیض کی شاعری کی مقبولیت ادب سے ہٹ کر سیاسی،ان کا مزدور تحریکوں سے منسلک ہونا اور راولپنڈی کیس میں اُن کا ملوث ہونا وغیرہ ہے۔فیض احمد فیض میری نظر میں ڈرائنگ روم کے شاعر تھے۔جہاں شراب کے دور کے ساتھ ساتھ اُن کی شاعری چلتی تھی،آپ بتائے وہ انقلابی شاعر تھے لیکن کیا ہم انھیں پابلو نرودا کے ہم پلہ پاتے ہیں؟ بالکل نہیں۔راشد کی شاعری اور میرا جی کی شاعری پر اُن کے بیانات بے بنیاد اور غلط ہیں۔میری نظر میں راشد کا نہ صرف کینوس بہت بڑا ہے بلکہ اُن کے فن پارے بھی بیش قیمت ہیں۔راشد فارسی شاعری سے بے حد متاثر تھے اور انھوں نے فارسی کے جدید شعرا کے کلام کا بھی اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔یہ تراجم نثر میں ہیں۔میں راشد کو اُردو میں اقبال کی توسیع تصور کرتا ہوں۔اُن کا بلند آہنگ،غنائیت اور نوآبادیاتی نظام سے اُبھرنے والے جذبات اُنھیں ان کے عہد کے بڑے بڑے شاعروں میں ممیّز کرتے ہیں۔راشد اپنی طرز کے واحد شاعر ہیں۔فیض پڑھے لکھے آدمی تھے ان سے یہ ہرگز اُمید نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ راشد کے بارے میں ایسا غیر ذمہ دارانہ بیان صادر کرتے۔میرا جی کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ

گیتوں کے شاعر ہیں اور یہ کہ اُن کی شاعری میں Content نہیں سراسر غلط ہے۔ مجھے تو Content فیض کی شاعری میں نظر نہیں آتا۔ میراجی نے تقریباً 250 سے زیادہ نظمیں کہیں اور ہر نظم ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے۔ ان نظموں میں ''چل چلاؤ''، ''ابوالہول''، ''میں کہ روتا ہوں مسرت سے''، ''اونچا مکان''، ''محرومی''، ''جاتری''، ''فنا''، ''نئی یا پرانی بات''، ''ارتقا''، ''یعنی'' اور ''یگانگت'' بے حد کامیاب نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ میراجی نے نظم میں ہیئت کے جو تجربے کیے ہیں وہ نادر ہیں نیز انھوں نے 100 سے بھی زائد گیت لکھے ہیں۔ میراجی کی نظموں میں جو Content ملتا ہے اس کا عشرِ عشیر بھی فیض کے یہاں نہیں ملتا۔ میراجی ایک بڑے شاعر تھے۔ قدرت نے انھیں ہم سے بہت جلد چھین لیا ورنہ وہ اس عہد کے بہت بڑے شاعر ہوتے۔

اکرم نقاش : آپ کی غزلوں کے نئے مجموعے ''سانسوں کے پار'' میں ''غزل کی نفی میں'' کے عنوان سے پیش لفظ میں آپ نے لکھا ہے ''غزل کے لکھنے کا مقصد یہ بھی تھا کہ میں دیکھوں کہ یہ صنفِ سخن اپنے خالق سے کس طرح کے جمالیاتی اور لسانی تقاضے کرتی ہے اور یہ بھی کہ تخلیق کار ان تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے کہ نہیں اپریل 2012 دسمبر 2012 تک ڈھیر ساری غزلیں خلق ہوئیں ان کی تعداد کچھ 800 کی قریب تھی''۔ اور آپ نے آگے یہ بھی لکھا ہے کہ ''نہ چاہتے ہوئے بھی ڈھیر ساری غزلیں خلق ہوئیں''۔ اس بیان میں دو متضاد باتیں آگئی ہیں ایک جس میں آپ نے غزلیں لکھنے کے مقصد کا ذکر کیا ہے اور دوسری طرف ''نہ چاہتے ہوئے بھی'' کا فقرہ بھی لکھا ہے وضاحت چاہوں گا؟

خلیل مامون : اس میں تضاد کہاں ہے میں غزلیں کہنا چاہتا تھا نہ چاہتے ہوئے بھی کا مطلب یہ ہے کہ اتنی ساری غزلیں لکھنے کا ارادہ نہیں تھا، اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

اکرم نقاش : اسی پیشِ لفظ میں آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو شاعر سے وہی کہلواتی ہے جو وہ کہلوانا چاہتی ہے۔ غزل کا ہر اظہار اس کی بحر اس کے قوافی اور اس کی ردیف پر منحصر ہے''۔ کیا یہ بات کلی طور پر درست کہی جاسکتی ہے؟ تفصیل سے بتائیں؟

خلیل مامون : یہ بات کلی طور پر کہی جا سکتی ہے۔سب کچھ غزل کی ہیئت پر منحصر ہے۔غزل ایسی صنف ہے جو کوئی زبردست بوجھ اُٹھانے کی متحمل نہیں ہے اوراس میں وہی کچھ سما سکتا ہے جس کی وہ ہدایت دیتی ہے۔شعر کے با معنی ہونے کا دارومدار الفاظ کی بندش پر ہے۔اگر بحر اس سے موزوں نہیں تو شعر ہی نہیں ہوگا۔آپ ردیف قافیہ کو نظر انداز کر کے غزل نہیں لکھ سکتے اور پھر مصرعہ اولیٰ اور مصرعہ ثانی کی معنوی بندش بھی بہت ضروری ہے ورنہ شعر مہمل ہو جائے گا۔

اکرم نقاش : ''سانسوں کے پار'' کے پیشِ لفظ کا عنوان ''غزل کی نفی میں'' ہے لیکن اس میں آپ غزل کا دفاع کرتے بھی نظر آتے ہیں۔پہلا دفاع تو یہی کہ یہ ''سانسوں کے پار'' غزلوں کا مجموعہ ہے۔میرے خیال میں آج تک غزل کی تکنیکی حدود پر جتنی بحثیں اوراعتراضات ہوئے ہیں اس کی وسعتیں بھی اس سے کہیں زیادہ بیان ہوئی ہیں۔آپ اس ضمن میں کیا کہنا چاہیں گے؟

خلیل مامون : غزل کی وسعت کیا ہے مجھے اس کا علم نہیں آپ مجھے بتائیں کہ کس طرح کی وسعت ہے جو غزل میں موجود ہے؟

اکرم نقاش : مجھے محمود ایاز کی ایک بات یاد آ رہی ہے وہ کہتے ہیں'' آج بھی میں غزل گوئی کو نظم گوئی پر ترجیح دیتا ہوں غزل کا ایک شعر کہہ کر مطمئن ہو جاتا ہوں تو مجھے اس کوزے میں بند دریا کو پھیلا کر نظم کا روپ دینے میں کوئی دل چسپی نہیں۔خیر یہ ایک طویل مباحثہ کا موضوع ہے۔

اکرم نقاش : کرناٹک اردو اکادمی کی تاریخ میں آپ کے دورِ صدارت کو اکادمی کا سنہرا دور کہا جائے تو بے جانہ ہوگا نہ صرف کرناٹک بلکہ ہندوستان بھر میں آپ نے اکادمی کے وجود کا احساس دلایا اوراکادمی کے دائرۂ کار کی وسعت اور امکانات کی نشان دہی بھی کی اگر صدارت کا ایک اور Term آپ کو مل جاتا تو اردو کی ترویج و بقاء کے لیے آپ کے پاس کیا منصوبے تھے؟

خلیل مامون : اکادمی کا ایک اور Term دیے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ نہ صرف یہ کہ اقلیتی امور کے وزیر ڈاکٹر ممتاز علی خان میرے خلاف تھے بلکہ الامین کے ڈاکٹر ممتاز احمد خان کو بھی انھوں نے میرے خلاف کر رکھا تھا۔ باخبر ذرائع سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ کسی وقف جائیداد کے تعلق سے اُن دونوں حضرات میں کچھ ساز باز ہوئی تھی۔ یہی نہیں وزیر موصوف نے اس وقت کے رجسٹرار کو اور کچھ اراکین کو بھی میرے خلاف اپنی سازش میں شریک کر کے انھیں گورنر بھاردواج کے پاس بھیجا تھا۔ اکادمی جب تحلیل کر دی گئی تو حکومت کے خلاف ایک بھی آواز نہیں اٹھی۔ اُردو زبان و ادب کے فروغ کا مسئلہ دراصل سیاسی اور سماجی ہے۔ جب تک اس مسئلہ کا حل نہیں نکالا جاتا آپ لاکھ پروگرام کر لیجیے اُردو زبان و ادب کا فروغ ناممکن ہے اور پھر میرے جیسا آدمی موجودہ نظام میں کسی بھی طرح فٹ نہیں ہوتا۔

اکرم نقاش : آج جو نظمیہ شاعری ہو رہی ہے اس کے بارے میں آپ کیا سوچتے ہیں؟ اور ہندوستان میں شاعری کی موجودہ صورتِ حال کیا ہے؟

خلیل مامون : ہندوستان میں شاعری بالخصوص نظم کی موجودہ صورتِ حال بہت ہی خراب ہے۔ ہندوستان میں غزلیں تو ڈھیر ساری لکھی جا رہی ہیں کچھ لوگ نظمیں بھی لکھ رہے ہیں لیکن صورتِ حال اچھی نہیں ہے کسی کا کوئی تجربہ نہیں، کوئی مشاہدہ نہیں۔ اظہار نیا نہیں، ایسا لگتا ہے کہ شعرا کے یہاں کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ جو نظمیں لکھی جا رہی ہیں اُن میں ہندوستان کی صورتِ حال کہیں نہیں جھلکتی ہے۔ ہندوستان میں نظم تعطل کی شکار ہے اور اسے بحال کرنے والا کوئی نہیں۔ نقاد اپنے شخصی بغض و عناد اور انعامات کی دوڑ میں مبتلا ہیں۔ اُنھیں اُردو کے لکھنے والوں سے کوئی علاقہ نہیں۔ لہٰذا نئی نظم ایک ایسے بحران کی شکار ہے جس کا فوری طور پر کوئی حل نظر نہیں آتا۔

اکرم نقاش : ادب میں تنقید کا رول کیا ہونا چاہیے؟ اور آزادی کے بعد ہندوستان میں تنقید کی سمت و رفتار کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟ کیا آج کی تنقید تخلیق کی راہوں کو روشن

کرنے میں کامیاب ہوسکی ہے؟

خلیل مامون : ادب میں تنقید کا رول محض تشریحاتی یا توضیحاتی نہیں ہونا چاہئے۔ میں نے ابھی جو باتیں جدید نظم کے تعلق سے کہی ہیں اُس پر آج کے بڑے نقاد کچھ لکھتے کیوں نہیں۔آزادی کے بعد چند مغربی نظریات سے متاثر ہو کر کچھ تنقید لکھی گئی لیکن اس کی نوعیت زیادہ تر تشریحاتی ہے۔اس کے علاوہ ماضی کے مشاہیر ادب پاروں کی تفہیم کے سلسلے میں بہت ساری تنقیدی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ نیز نثر اور نظم کی اصناف پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ بلاشبہ اس طرح کی تنقید سے نئے لکھنے والوں کی رہنمائی ہوتی ہے لیکن کتنے نقادوں نے آج کے ادب کی ہیئت اور اُس کے مواد کی کمیوں کی جانب اشارہ کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ ادب میں ہر اعتبار سے جمود طاری ہے اور اس کے لیے کیا کرنا چاہئے۔ یہ ایک طرح کی دوراندیشی کی تنقید ہے جو کسی بھی فن کے تعلق سے سامنے آنی چاہئے۔ اور یہ کہا جانا چاہئے کہ اب کس بات کی ضرورت ہے۔اس نوعیت کی کوئی بھی بات میری نظر سے نہیں گزری ہے نہ ہی اس بابت میں نے کچھ سنا ہے۔ اچھے اور انقلاب انگیز ادب کی تخلیق کی جانب ایسی تنقید ایک قدم کے مصداق ہوگی۔ جو آج وجود نہیں رکھتی۔ میں یہ جانتا ہوں کہ آپ ڈنڈے کے زور پر اچھی نظمیں نہیں لکھا سکتے۔لیکن آپ ایک ایسا ماحول تو پیدا کر سکتے ہیں کہ جہاں اچھا ادب لکھنے کے امکانات پیدا ہوسکیں۔ نہ ہمارے رسالوں کے مدیروں میں یہ صلاحیت ہے نہ اُردو کے اساتذہ میں اور نہ ہمارے نام نہاد ناقدوں میں۔ میؔر پر آپ کو پچاسوں کتابیں مل جائیں گی، غالب پر ملیں گی، منٹو پر ملیں گی، لیکن آپ کو تنقید کی کتابوں میں کوئی ایسی انقلاب انگیز کتاب نہیں ملے گی جو یہ بتاتی ہو کہ آج کے اُردو ادب اور ادیب کو کس چیز کی ضرورت ہے۔ اچھے ادب کی تخلیق کے نہ ہونے میں یہاں تنقید کا نہ ہونا مانع ہے وہاں اکادمیوں اور دیگر قومی اور نجی اداروں کی طرف سے انعام و اکرام کی بارش ہے جو لکھنے والوں کو غلط راہ پر ڈال رہے ہیں۔ آج کل تو ادیب و شاعر محض انعام حاصل کرنے کے لیے ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ وہ اس لیے نہیں لکھ رہے

ہیں کہ لکھنا اُن کی ذاتی،فطری اور سماجی مجبوری ہے۔اور صورتِ حال یہ ہے کہ ادب اور شاعر پیچھے چلے گئے ہیں۔اور ناقد اور مدیر آگے آ گئے ہیں۔جب کہ صورتِ حال اس کے برعکس ہونی چاہیئے ۔اس صورتِ حال کے پیدا کرنے میں بڑی حد تک ہمارے ناقد ذمے دار ہیں کیوں کہ جب تک شاعر یا ادیب کسی ناقد کی انگلی پکڑ کرنہیں چلے گا۔اچھا ادیب نہیں بن سکے گا۔ہر لکھنے والے کو آج ناقد کی سند کی طلب ہے یا نہیں تو ادبا و شعرا کسی ایوارڈ کے لیے ناقد پر منحصر ہیں۔ہمیں اس صورتِ حال سے نکلنا چاہیئے۔صحیح طور پر ادب لکھنے والے ہر ادیب کو اخلاقی جرات مندی کا ثبوت دینا چاہیئے اور اپنی شاعری یا افسانے کا اپنی اچھی تحریر سے نقیب ہونا چاہیئے۔بجائے اس کے کہ وہ کچھ لکھنے کے بعد کسی ناقد کی تلاش میں نکل پڑے۔آج تنقید کا مطلب کسی کتاب کے شروع میں موجود تقریظ ہے یا پھر فلیپ پر کسی ناقد کی رائے کچھ ناقدوں نے تو اپنی تقریظات کو مجتمع کر کے کتابی شکل بھی دے دی ہے اور معصوم ادیب و شاعر ایسی کتابوں کو مقدس کتابوں کا درجہ دے رہے ہیں۔کچھ ناقد رسالوں میں اپنے خاص نمبر نکلوا رہے ہیں۔خود پر سیمینار کروا رہے ہیں جب کہ اچھے سچے اور غریب شاعر و ادیب زندگی میں اور اس کے بعد اپنی اپنی قبروں میں کسی اچھے دن کا انتظار کر رہے ہیں۔یہ صورتِ حال قعرِ مذلت میں گرنے سے بدتر ہے اور ایک بڑے اخلاقی انحطاط کی تصویر پیش کرتی ہے۔ ●●

(مطبوعہ اذکار 29۔2015،بنگلور)

اکرام باگ

نام : اکرام الدین باگ

قلمی نام : اکرام باگ

پیدائش : 8/ستمبر 1948، بسوا کلیان، بیدر (کرناٹک)

تعلیم : ایم اے، پی ایچ ڈی (اُردو)

مصروفیت: درس وتدریس، بہ حیثیتِ صدر شعبہ اُردو ایس ایس کے بی کالج، بسوا کلیان حسنِ خدمت پر سبک دوشی۔

تصانیف : 1) کوچ (افسانوی مجموعہ) 1986

2) اندوختہ (افسانوی مجموعہ) 2014

انعامات واعزازات: 1) کرناٹک اُردو اکاڈمی ایوارڈ برائے فکشن (مجموعی خدمات)

2) بہار اُردو اکاڈمی ایوارڈ برائے ''کوچ''

3) پرسارنگا ایوارڈ گلبرگہ یونیورسٹی برائے ''کوچ''

رابطہ : 09945969995

اکرام باگ سے ایک مکالمہ

اکرم نقاش : افسانے کی ہیئت میں آپ کی تجربہ پسندی نے ایک بڑے حلقے کو متوجہ کیا ہے کسی بھی فن میں تجربہ شعاری غیر معمولی فنی استعداد اور معمول سے زیادہ خود اعتمادی کا تقاضہ کرتی ہے۔ وہ کون سے محرکات تھے یا وجوہات تھیں کہ آپ نے رواجِ عام سے یکسر انحراف کرتے ہوئے ایک نئی نہج کو اپنایا؟

اکرام باگ : رواج عام سے انحراف کرنا میرے مزاج کے عین مطابق ہے خواہ وہ مروجہ ہیئت میں ہو کہ تجربہ پسندی میں۔ میں نے ہیئتی تجربے سائنسی علوم، ریاضیات، جیومیٹری اور علم الاعداد کی مدد سے کیے۔ ان کا واحد مقصد عام حلقہ کو متوجہ کرنا نہ تھا بلکہ ایک خاص حلقہ اور اپنے آپ کو مطمئن اور متوجہ کرنا تھا۔ میرا اس نوع کا پہلا تجربہ شب خون 21 میں شائع ہوا جسے فاروقی صاحب نے انور سجاد اور مین را کے ساتھ شائع کیا۔ اس افسانے کی کہانی ایک پامال سے موضوع پر تھی۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی جب الہ آباد سے ہی ایک نامی گرامی ادیب نے میرے افسانے کی پوری کہانی کو 'من وعن' الفاظ میں رقم کر دی اور اسے شائع کروانے پر اصرار کیا۔ میں نے ان سے معذرت چاہی۔ ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا کہ میں ذاتی وجوہات کی بنا پر اسے شائع کرنا مناسب خیال نہیں کرتا اور پھر یہ کہ آپ نے اس افسانے کو پوری طرح نہیں سمجھا......... دیکھئے اکرم نقاش صاحب، اس نوع کے ہیئتی تجربے اُردو میں مجھ سے پہلے کسی نے نہیں کئے تھے اور اغلب ہے کہ اس نوع کے تجربوں کا دوسری زبانوں میں بھی مروج ہونے کا ذکر نہیں ملتا۔ میں یہاں ایک

بات بڑے شدومد سے کہنا چاہوں گا کہ اس نوع کے تجربے اگر شمال کے کسی افسانہ نگار نے کیے ہوتے تو دن رات اس کا بکھان ہوتا رہتا۔ بعد میں چند ایک نے نقالی اور شعبدہ بازی کی حد تک اپنایا مگر اس نوع کو نہیں پا سکے۔ میرے ہئیتی تجربے افسانے میں کہانی کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اس لیے وہ بیانیہ کا ایک حصہ ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ افسانے اعلیٰ درجہ کی افسانہ نگاری کا نمونہ ہیں مگر میں یہ ضرور مانتا ہوں کہ یہ الگ، منفرد اور بے مثل، کامیاب افسانہ نگاری کا اظہار ہیں۔ حال ہی میں ایک علی گڑھ کے پروفیسر نے مجھ سے بنگلور میں کہا کہ ''کیا بات ہے کہ اب آپ کے مہمل قسم کے افسانے نظر نہیں آتے!'' میں نے جواب دیا کہ ''آپ مدرسے سے آئے ہیں اور اُن دنوں مدرسوں میں سائنسی علوم کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی''۔ پروفیسر شافع قدوائی سنی ان سنی مدرا میں آگے بڑھ گئے اور پروفیسر م۔ ن۔ سعید صاحب مسکرا کر رہ گئے۔ میں علی گڑھ کے پروفیسر صاحب کو مشورہ دوں گا کہ وہ میرے نئے افسانوی مجموعہ اندوختہ کے تازہ افسانے نہ سہی مجموعے کے فلیپ پر دی گئی نارنگ صاحب کی رائے ضرور پڑھیں۔ نارنگ صاحب کی مذکورہ رائے سے اتفاق نہ کرتے ہوئے زبیر رضوی نے مجھے اطلاع دی کہ ''نارنگ صاحب کی رائے گم راہ کن ہے البتہ میں وارث علوی کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔'' اور وارث علوی نے میرے افسانوں کی از سرِ نو مخلصانہ قدر کرنے فہمائش کی ہے۔

اکرم نقاش : جدیدیت کے آغاز میں احمد ہمیش نے اپنی ابتدائی تخلیقات سے ہی نقادوں اور فکشن نگاروں کو چونکا دیا تھا۔ خصوصاً ان کی منفرد نثر اور ان کا مخصوص بیانیہ اور موضوعات چونکانے والے تھے۔ مکھی کے پیش لفظ میں احمد ہمیش نے آپ کے افسانوں کے اختصاص کے ذکر کے ساتھ ساتھ آپ کے افسانوی طرز پر اپنی عدم دسترس کا ذکر بھی کیا ہے۔ احمد ہمیش کا یہ بیان کیا آپ کے افسانوی Pattern کو مزید مستحکم کرنے کا باعث بنا؟ احمد ہمیش کے بیان کی آپ کے نزدیک کیا حیثیت ہے؟

اکرام باگ : میں نے احمد ہمیش کا افسانہ 'مکھی' ظفر اوگانوی کے رسالے اقدار میں پڑھا تھا۔ واقعی احمد ہمیش نے اپنے منفرد اسلوب سے ادبی دنیا کو چونکایا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ

حیدرآباد میں قیام پذیر ہیں۔ ایک دن اچانک اپنے گاؤں کلیانی کے عرس کے مشاعرہ میں ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ڈاکٹر غیاث صدیقی اور دیگر ساتھیوں کے ہم راہ کھینچ کر لائے گئے تھے۔ میں اُن سے ملا تو ان کی شخصیت بھی پُرکشش لگی۔ پھر اُن سے خط وکتابت ہوتی رہی اور پھر حیدرآباد میں ان کی قیام گاہ 'شاک پائنٹ' پر ملاقاتوں کا سلسلہ رہا۔ احمد ہمیش یو۔پی کے گاؤں بلیا کے رہنے والے تھے۔ وہاں کے لوگوں کا خاصہ ہے کہ وہ ہمیشہ دو متحارب گروپ پیدا کرنے اور اپنی پہچان پیدا کرنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ چناں چہ احمد ہمیش نے حیدرآباد میں وہاں کے لاڈلے مخدوم محی الدین پر سخت نکتہ چینیاں کیں اور اوریئنٹ ہوٹل پر بحث ومباحث کا سلسلہ چلتا رہا۔ بے فکروں کا ایک ٹولہ شب وروز احمد ہمیش کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے لگا۔ حیدرآباد کا ادبی حلقہ جواب تک سکتہ میں زندگی کاٹ رہا تھا، اچانک ہی بیدار ہوگیا۔ سلیمان اریب کے 'صبا' میں ادبی جگمگاہٹ پیدا ہوئی۔ اب تک ایک خاتون فن کار کے سہارے زندہ یہ شہر، ادبی سرگرمیوں کا مرکز بننے لگا۔ اریب، شاذ، اقبال متین، عوض سعید، مغنی تبسم، رؤف خلش، حسن فرخ، مصحف اقبال توصیفی، انور رشید اور پھر مظہر الزماں خاں، بیگ احساس کے قلم وقفہ وقفہ سے جاگ اٹھے یہ احمد ہمیش کا ہی کارنامہ تھا۔ دوسری طرف احمد ہمیش ملکی سطح پر بھی اپنا ایک گروپ تشکیل دینے میں کوشاں تھے۔ انھوں نے اس سلسلہ میں اپنے طور پر چند نام، اختر یوسف، اکرام باگ، وہاب دانش، صادق، ویریندر، عتیق اللہ، مغنی تبسم وغیرہ مختص کر رکھے تھے۔ اس لیے ان کا میرے افسانوں پر کیا گیا کمنٹ، میں نہیں سمجھتا کہ کوئی اہمیت دینے کے لائق ہے۔ وہ بے حد مخلص فن کار تھے۔ میں ان سے متاثر ہوا تھا۔ میں اور محمود ہاشمی نے ان کی سٹی زن شپ کے لیے کچھ کوششیں کی تھیں۔ محمود ہاشمی بالخصوص بے حد فکر مند تھے مگر افسوس کہ یہ کاوشیں بارآور نہ ہوسکیں اور انھیں پاکستان لوٹ جانا پڑا۔ میرے افسانوی Pattern کا استحکام کسی اور کے بیان کا تابع نہ تھا۔

اکرم نقاش : کسی بھی صنف میں تجربہ پسندی عموماً مروجہ فارم یا ہیئت میں اظہار کی عدم تکمیلیت کے احساس کی زائیدہ ہوتی ہے۔ آپ اپنے افسانوں میں جو کچھ کہنا چاہتے تھے کیا اس وقت کا مروجہ طرز آپ کے اظہار میں حائل تھا؟

اکرام باگ : کوئی بھی فارم یا ہیئت اظہار کی راہ میں مانع نہیں ہوتی۔ ہوتا یہ ہے کہ تجربہ پسندی یا اظہار انفرادی میلان کا زائیدہ ہوتا ہے۔ حالاں کہ مجھے اپنی تجربہ پسندی پر چند جیّد لوگوں کی تحسین ملتی رہی ہے۔ میرے علم الاعداد پر لکھے گئے افسانوں پر فاروقی صاحب نے پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ نارنگ صاحب نے تو اسے میرے بھیڑ سے الگ ہونے کا اختصاص بتایا ہے۔ وارث علوی صاحب نے شکر ہے کہ اسے لتاڑا نہیں تھا۔ مہدی جعفر نے میرے طرز کو اچھے الفاظ سے یاد رکھا ہے۔ محمود ہاشمی نے اسے خوب خوب سراہا ہے۔ قمراحسن اور اختر یوسف نے بھی اسے پسند کیا ہے اور بھی بہت سے نام ہیں کہاں تک گناؤں۔ اس لیے مجھے تو ایک طرح کا اطمینان ہی نصیب تھا۔

اکرم نقاش : اکرام صاحب! میرا بنیادی سوال یہ تھا کہ ''کسی صنف میں تجربہ پسندی عموماً فارم یا ہیئت میں اظہار کی عدم تکمیلیت کے احساس کی زائیدہ ہوتی ہے۔'' سوال یہ ہے کہ کیا اس وقت کا رائج اسلوب آپ کے مافی الضمیر کو بیان کرنے کے لیے موافق ،مناسب یا مطابق نہیں تھا؟ یا آپ ایسی کوئی بات یا موضوع اپنے فن کے ذریعے پیش کرنا چاہتے تھے جس کا اظہار مروجہ سانچوں میں ممکن نہیں تھا؟ یا جیسا کہ آپ نے فرمایا کہ آپ ایک حلقہ کو متوجہ کرنا چاہتے تھے؟ اگر یہی مقصود و مطلوب ہو تو بات ٹھیک ہے؟

اکرام باگ : آپ کے بنیادی سوال کا جواب میرے اظہار میں غالباً پوشیدہ ہے۔ مروجہ اسلوب میں میرے مافی الضمیر کو بیان کرنے کے امکانات کافی سے زیادہ تھے مگر اسے ہیئتی تجربہ کیسے کہا جائے گا؟ اور پھر یہ کہ ان دنوں میرے لیے وہ موافق تھا نہ مناسب۔ کسی بھی تخلیق کو کسی کے نام معنون یا انتساب کرنا تخلیق کار کا حق تو ہے مگر اصل منشا نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تخلیق تو بہر حال خالق کے پنجۂ گرفت سے آزاد ہو ہی جاتی ہے۔ وہ کسی بھی خاص یا حلقہ کے لیے وقف نہیں ہو سکتی۔

اکرم نقاش : آپ کے افسانوں پر عمومی طور پر ابہام و اشکال کے الزام لگتے رہے ہیں۔ بڑے بڑے نقاد بھی آپ کے افسانوں کی عدم ترسیل کے شاکی نظر آتے ہیں اور آپ ان اعتراضات

سے بے نیاز معلوم ہوتے ہیں۔ترسیل وابلاغ کی اہمیت آپ کے نزدیک کیا ہے؟

اکرام باگ : ترسیل اور ابلاغ کے لیے ہی تو ادیب لکھتا ہے مگر اس کی بھی شرطیں ہیں۔اس صورتِ حال کے لیے ادیب اپنی سطح اور میلان کو بہت حد تک قربان نہیں کر سکتا۔میرا خیال ہے کہ لوگ توجہ اور سنجیدگی سے ادب نہیں پڑھتے اور محنت کرنے کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہے۔پھر قاری کا بھی اپنا مزاج اور انتخاب بھی ہوتا ہے۔اس لیے ہم کو بھی ان کا شاکی نہیں رہنا چاہیے میں خود بھی اکثر اوقات میں ابنِ صفی کو پڑھا کرتا تھا اور تسلی بھی ہو جایا کرتی تھی۔اکثر قاری کثیر المز اجی کا مادّہ اپنے اندر رکھتے ہیں اور مختلف نوع کے ادب سے محظوظ بھی ہوتے رہتے ہیں۔ادب،واقعہ یہ ہے کہ مخصوص لوگوں کی سنجیدہ سرگرمی ہے ابہام اور اشکال تو محض تنقیدی مفروضے ہیں۔وقت کے ساتھ یہ مفروضے متبدل ہوتے رہتے ہیں۔

اکرم نقاش : ترسیل کے لیے ہی تو ادیب لکھتا ہے یہ بات بالکل درست ہے لیکن یہ بات بھی اتنی ہی درست ہے کہ قاری کا ذوق اس کا مطالعہ بھی ہو جس کا تقاضہ آپ کرتے ہیں لیکن آپ کے افسانوں کی افہام وتفہیم یا نفسِ موضوع تک رسائی کے لیے قاری کو کتنا پڑھا لکھا ہونا چاہیے؟ بالخصوص زخشِ پا،عکسِ فنا اور برطرف فاصلے کی قبیل کے افسانوں کے لیے؟

اکرام باگ : آج انٹرنیٹ کا دور ہے۔اب آدمی کا بہت زیادہ پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں ہے۔ہر قسم کی معلومات آپ کو دستیاب ہو سکتی ہیں۔لیکن ہر قسم کے علم کا کشف ہونے کے لیے آدمی کا باذوق ہونا ضروری ہے تب ہی افہام وتفہیم کے دروازے کھل سکتے ہیں۔

اکرم نقاش : منٹو کے فن کے بارے میں آپ نے مولانا آزاد یونیورسٹی کے ایک سمینار میں کہا تھا کہ اس بات سے قطع نظر کہ فنی سطح پر منٹو ایک مکمل افسانہ نگار ہے لیکن اس کے موضوعات فی زمانہ از کار رفتہ معلوم ہوتے ہیں منٹو کے افسانے آج وہ بصیرت وانبساط نہیں عطا کرتے جوان افسانوں کے تخلیقی دور میں ان سے مخصوص تھی۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر مجھے اردو کے پچیس بہترین افسانوں کے انتخاب کا موقع ملے تو اس فہرست میں منٹو کا ایک بھی

افسانہ شامل نہیں ہوگا۔ آپ اس بیان کی توجیہ وتشریح فرمائیں گے؟

اکرام باگ : یہاں میرے بیان کو غلط تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ یونیورسٹی سمینار میں میں نے اپنے منٹو پر لکھے نوٹ میں انھیں ایک اہم افسانہ نگار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ میں افسانے کو ذاتی طور پر محض ارضی حقائق کا فن نہیں سمجھتا اور نہ ہی افسانے کو کردار نگاری کا فن خیال کرتا ہوں۔ میرے نزدیک افسانہ میں کردار سے زیادہ واقعہ اہم ہے ناول کی بات اور ہے۔ منٹو ارضی حقائق کا نباض تھا اور ٹھوس حقیقت پسندی سے اپنے افسانوی مواد کو پیش کرتا تھا جو آج از کار رفتہ ہے۔ ترقی پسند تنقید سے قطع نظر آج کے اہم نقادوں نارنگ، فاروقی اور وارث علوی نے منٹو کے بارے میں کیا لکھا ہے؟ نارنگ صاحب نے منٹو سے زیادہ بیدی کو اہمیت دی ہے۔ فاروقی صاحب نے برسبیلِ تذکرہ منٹو کے بارے میں صرف 3.5 لائنس تحریر کی تھیں (میرے منٹو پر لکھے گئے نوٹ سے پہلے) بعد میں ان کا طویل مضمون آیا۔ وارث علوی نے منٹو پر اعلیٰ درجہ کی تنقید لکھی ہے مگر اس کا پس منظر جدید افسانے کو نشانہ بنانے کے لیے تھا اور اپنے افسانوی نظریے کو پیش کرنا بھی مقصود تھا۔ میرا کہنا یہ تھا کہ اگر مجھے دس بڑے اُردو افسانوں کے منتخب کا موقع دیا جائے تو اس فہرست میں منٹو کا افسانہ نہ ہوگا۔ ہوسکتا ہے پندرہ میں ہو یا بیس میں۔ اب آیئے میں چند افسانہ نگاروں کی فہرست دیتا ہوں۔ کیا ان افسانہ نگاروں کے شاہ کار افسانوں کے مقابلہ میں منٹو کا کوئی افسانہ دس کی فہرست میں آسکتا ہے؟ وہ نام ہیں، پریم چند، غلام عباس، حیات اللہ انصاری، بیدی، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، رفیق حسین، ضمیر الدین احمد، اقبال مجید، غیاث احمد گدی، انور سجاد، سریندر پرکاش، احمد ہمیش، نیر مسعود، معین الدین جینا بڑے اور خالد جاوید اور سید احمد اشرف۔ پھر یہ بھی کہ یہ آپ کا انتخاب نہیں ہے۔ میں تو وارث علوی کے احترام میں اپنی رائے سے اجتناب کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتا۔

اکرم نقاش : جدید افسانے کی جب بھی بات ہوتی ہے اور ناموں کے ساتھ بلراج مین را کا ذکر بھی لازم ہے۔ بلراج مین را کے افسانے اور ان کے بیانات بھی خاصے چونکانے والے رہے ہیں۔ مین را کے اور ان کے بیانات کے بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہوں گا۔ مثلاً

مین را اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں ''کرشن چندر نے 52ء کے بعد کوئی کہانی نہیں لکھی اور بیدی صاحب نے اگرچہ کوئی بڑی کہانی نہیں لکھی لیکن غیر ادب بھی نہیں لکھا'' اور فراق کی شاعری کے بارے میں فاروقی صاحب کی رائے کے متعلق ان کا یہ کہنا کہ ''خود فاروقی صاحب کی شاعرانہ حیثیت کیا ہے؟ ان کی تنقید بھی ایسی ہی ہے۔'' وغیرہ آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

اکرام باگ : اس میں تو کلام نہیں کہ بلراج مین را جدید افسانے کا نمایاں نام ہونے کی حد تک لازمی ہو گیا تھا۔ تقدیم کی بھی ایک قدر ہوتی ہے۔ پھر مین را نے اس کے لیے محنت بھی خوب کی تھی۔ ایک تو وہ دلی میں رہتے ہیں۔ وہ ٹی۔وی پر بھی کام کرتے رہے ہیں اس لیے ٹی آر پی بڑھانے کے گُر سے بھی بہ خوبی واقف ہیں۔ دلی میں کئی نقاد Available ہیں جو مختلف فکشنز میں کچھ نہ کچھ پڑھنے کی اکاڈمک مجبوریوں کے ہاتھوں بندھے ہوئے ہیں۔ سفارت خانے، قونصل خانوں کی سہولیات یونیورسٹیوں میں ادبی محفلیں سجتی رہتی ہیں۔ مباحثے، میل ملاپ، گپ شپ، وعدے، تیقنات پنپتے رہتے ہیں۔ دلی سے رسائل بھی نکلتے رہتے ہیں۔ بلراج مین را نے بھی وقفہ وقفہ سے مین را جنرل، دستاویز اور شعور نامی رسائل ایڈیٹ کیے ہیں۔ پڑوسی ملک سے وہاں کے ادبی حلقوں سے تعلقات بحال کرنے کے سلسلہ میں منٹو کے نام اور کام کو اچھالتے بھی رہے ہیں۔ جدید افسانے کے آغاز ہی میں ایک تجرباتی مضمون میں گوپی چند نارنگ نے افہام و تفہیم کے مدِ نظر بلراج مین را کے دو تین افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا تھا۔ اب کیا بچا تھا۔ ان تمام اوصاف کے بعد اگر مین را کرشن چندر پر ہلکا کمنٹ کرتے ہیں تو اس میں برائی کیا ہے؟ اسی طرح بیدی کے بارے میں ان کی رائے میں کتنا دم ہے اس کا اندازہ خود مین را کو بھی اچھی طرح ہوگا۔ فاروقی صاحب کے بارے میں اُن کی رائے سے تحسین کا پہلو بھی نکالا جا سکتا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود مجھے مین را کا افسانہ کمپوزیشن بے حد دل فریب لگتا ہے۔ بقیہ یہ ہے کہ وہ ایک اوسط درجہ کے جدید افسانہ نگار ہیں۔ مین را کو سریندر پرکاش، احمد ہمیش اور انور سجاد کے ساتھ بریکٹ نہیں کیا جا سکتا۔

اکرم نقاش : آپ کی بیش تر بلکہ 90% کہانیاں شب خون میں شائع ہوئیں اس کی کوئی خاص وجہ؟

اکرام باگ : کوئی خاص وجہ تو نہیں ہے مگر یہاں چند باتوں کے تذکرے سے شاید آپ پر بات کھل جائے گی۔ مجھے اپنے ہیئتی تجربوں میں جو افسانہ سب سے بہتر لگا اس کا عنوان ''برطرف فاصلے'' ہے۔ میں نے یہ افسانہ شب خون کے بجائے ''کتاب'' کو بھیجا۔ مجھے خود بھی اندیشہ تھا کہ عابد سہیل صاحب شاید اُسے شائع نہیں کرسکیں گے اور حسبِ توقع ایسا ہی ہوا۔ عابد سہیل صاحب کا خط آیا کہ کتاب کی پالیسی انھیں یہ اجازت نہیں دیتی کہ اسے یہاں شائع کیا جاسکے مگر انھوں نے میری جرأت مندی کو سراہا اور ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا کہ میں افسانے پر ایک نظر اور ڈال لوں۔ میں نے یہ افسانہ شب خون کو بھیجا اور وہ شائع ہوا۔ مگر فاروقی صاحب نے پہلی بار مجھے یہ لکھا کہ میں اپنے ''اشہب ذہن'' کو کسی اور طرف بھی لگاؤں۔ ''اندوختہ'' (مجموعہ) شائع کرتے ہوئے میں نے عابد سہیل صاحب کی بات پر دوبارہ غور کیا اور اچانک ہی ایک جھماکے کے ساتھ وہ تبدیلی ذہن کے پردوں پر منعکس ہوئی۔ چناں چہ افسانہ 'برطرف فاصلے' تبدیلی کے ساتھ دوبارہ شائع ہوا ہے۔ میں عابد سہیل کی روح کو سلام کرتا ہوں کہ غالباً انھوں نے اسی کمی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں نے 'اندوختہ' سوغات کو بھیجا۔ مجھے اندازہ تھا اس کا وہاں شائع ہونا مشتبہ ہے۔ محمود ایاز وسیع مطالعہ کے آدمی تھے مگر ان کا مطالعہ زیادہ تر کلاسیکل اور رومانوی تحریروں تک محدود تھا۔ وہ جدید تر ادب کے معاملہ میں پُر جوش نہ تھے۔ بورہس اور کافکا کی تحریروں سے واقف تھے مگر ان کے لیے ان کے یہاں کوئی خاص لگاؤ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ بہت حد تک ظاہری لحاظ سے Showy قسم کے آدمی تھے۔ سوغات کے سلسلہ میں وہ کمرشیل اینگل کا بھی خاص خیال رکھتے تھے۔ اپنے ہر عمل کو انجام دینے سے پہلے اس کا پروپیگنڈہ کرنے میں ماہر تھے۔ کرشن چندر کا افسانہ لوٹانے کا شہرہ انھوں نے خوب خوب کیا۔ اس طرح کا طرزِ عمل اُردو کے مدیروں کا خاصہ رہا ہے اور یہ اُن کا حق بھی ہے۔ خیر نیر مسعود کو شائع کرنے سے پہلے اُن کے آباواجداد کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرلیں۔ دو تین مضامین لکھوائے۔ فاروقی صاحب اور دیگر ادیبوں کے ساتھ ایک مذاکرہ کرڈالا۔ وارث علوی اور مغنی تبسم سے مشورہ کیا اور پھر نیر مسعود کو بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا اور

ایک تنقیدی نوٹ بھی لکھ مارا۔ وہ مکھی پر مکھی مارنے کا ہنر بھی خوب جانتے تھے۔ بہر حال انھوں نے میرا افسانہ لوٹاتے ہوئے لکھا کہ ''علاوہ اور دیگر باتوں کے افسانہ سوغات میں شائع نہیں ہوسکتا۔'' بعد میں وہی افسانہ شب خون میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوا۔ فاروقی صاحب نے اسے خوب سراہا۔ میں مدیروں کے فیصلوں کو ان کا ذاتی حق مانتا ہوں مگر میرے ساتھی حمید سہروردی بڑے بددل ہو جاتے تھے۔ ان کی بڑی تمنا تھی کہ وہ بھی شب خون میں اپنے افسانے شائع ہوتا دیکھیں۔ چناں چہ انھوں نے اپنا ہر افسانہ شب خون کو بھیجا مگر وہاں سے معذرت چاہی جاتی۔ اُن کی ہر بار کی ہلکان کو دیکھ کر میں نے بھی شب خون کو اس بابت خطوط لکھے مگر ہر بار ٹکا سا جواب ملتا۔ حالاں کہ حمید سہروردی ہندوستان کے ہر رسالے میں شائع ہو رہے تھے مگر انھیں اطمینان حاصل نہ تھا۔ آخر کار بڑی تگ و دو کے بعد ان کا افسانہ شب خون میں شائع ہوا اور وہ اطمینان کی نیند سوئے۔

اکرم نقاش : میں نے آپ کے افسانوں سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''بیانیہ کی نہج بے حد مختلف ہونے کے باوجود اکرام باگ اور نیر مسعود ہمارے عہد کے ایسے افسانہ نگار ہیں جو اسرار و تجسس کو خلق کرنے، کہانی کے بیان سے گریزاں اور موضوع کو پردوں میں چھپانے کے فن میں مماثل نظر آتے ہیں۔ آپ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں؟

اکرام باگ : نیر مسعود غالباً بہت پہلے سے افسانے خلق کر رہے ہوں گے مگر وہ مجھ سے بہت بعد میں شائع ہونے کی طرف راغب ہوئے۔ نیر مسعود کا بیانیہ اور زبان کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ اپنے افسانوی مواد میں وہ کہیں سے بھی ملوث نہیں ہوتے۔ اُن کا اپروچ اور Detachment مثالی ہے۔ وہ میرے پسندیدہ افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں۔ اس لحاظ سے میں آپ کی رائے سے پوری طرح اتفاق نہیں کرسکتا۔

اکرم نقاش : اتفاق سے میری رائے سے اتفاق آپ کے جواب میں موجود ہے کہ میں نے آپ کے اور نیر مسعود کے افسانوں کے بیانیہ کی نہج بے حد مختلف ہونے کی بات کہی ہے۔ آپ دونوں کے ہاں مجھے تطابق کہیں نظر آتا ہے تو وہ یہ کہ آپ دونوں کہانی بیان کرنے سے

زیادہ کہانی کو مہین پردوں میں چھپانے کے فن میں مماثل نظر آتے ہیں؟

اکرام باگ : نیر مسعود صاحب اُلجھی ہوئی باتوں اور حقیقتوں کو سلجھے ہوئے بیانیہ میں بیان کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ میں سلجھی ہوئی باتوں اور حقیقتوں کو اُلجھے ہوئے انداز میں پیش کرنے کی سعی کرتا ہوں۔

اکرم نقاش : اپنے افسانوں کی طرح آپ کی شخصیت بھی بڑی پراسرار اور پیچیدہ ہے۔ خود پراسرار کے پردے ڈالنا، شخصیت کو چھپائے رکھنے کا جواز آپ کے نزدیک کیا ہے۔ جب کہ خود انکشافی ہی دنیا کے وجود میں آنے کا سبب تسلیم کیا جاتا ہے؟

اکرام باگ : کاش میں ایسا ہو پاتا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ مجھے جہاں خاموش رہنا ہوتا ہے وہاں میں بولتا رہتا ہوں اور جہاں مجھے بولنا ہوتا ہے وہاں میں خاموش سا ہو جاتا ہوں۔ مجھے تو یہ میرے دوستوں کی اُڑائی ہوئی گپ لگتی ہے۔ ہاں میں بڑا منتشکّی آدمی ہوں۔

اکرم نقاش : وارث علوی گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی ان نقادوں کی تنقید ان کی تنقیدات کے اثرات کے بارے میں تفصیل سے جاننا چاہوں گا (فکشن کے حوالے سے)

اکرام باگ : فکشن کی تنقید کے سلسلہ میں ہندوستان میں اور بھی کئی نقادوں کے نام ذہن میں آتے ہیں بالخصوص فضیل جعفری، عتیق اللہ اور شمیم حنفی۔ فی الحال میں تفصیلات میں جانے کے حق میں نہیں ہوں۔ میں یہاں عمومی اثرات میں گئے بغیر ذاتی حوالے سے چند اشاروں پر اکتفا کروں گا۔ فاروقی صاحب کی تنقید سے میں نے افسانے کی مبادیات سے استفادہ کیا۔ ادیب کی آزادی کے معنی سمجھے۔ انھوں نے مجھے ہر قسم کے ہیئتی تجربوں کو کرنے کا حوصلہ دیا۔ مجھے یہ ماننے میں کوئی تامل نہ ہوا کہ افسانہ ایک چھوٹی صنف ہے، شاعری کے مقابلہ میں۔ گوپی چند نارنگ کے جدید افسانوں کے تجزیاتی مطالعہ سے تجرید، علامت اور تمثیل کو وقار ملا۔ انھوں نے اپنے بلند مرتبت نقاد ہونے کا فائدہ اُردو زبان وادب اور ادیبوں کے حق میں استعمال کیا اور آج کئی ادیب پورے اعتماد اور وقار کے ساتھ ادب

وزبان کی خدمت میں مصروف ہیں ۔انھوں نے میرے بارے میں لکھا کہ میں جدید افسانے کے کارواں میں شامل تھا اور اس کارواں سے الگ بھی تھا۔وارث علوی نے حقیقت پسند افسانے کے استحکام میں نمایاں ترین خدمات انجام دیں ہیں۔علوی صاحب نے میرے افسانوں کی از سرِ نو قدر خوانی کا حوصلہ بخشا۔انھوں نے زور دے کر یہ ثابت کرنے کی سعی کی کہ افسانہ چھوٹی صنف نہیں ہے۔اس تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ فاروقی صاحب بے حد سنجیدہ شریر، نارنگ صاحب بے حد ہم درد، وسیع النظر اور وارث علوی صاحب بے حد بے خوف، بے ریا نقاد ہیں۔

اکرم نقاش : جدید فکشن میں ایسے کون سے نام ہیں جن کا فن آنے والے وقتوں میں زندہ رہے گا اور دیر تک زندہ رہے گا؟

اکرام باگ : آنے والے وقتوں میں جدید فکشن کی معنویت اور معیار کا دارومدار قمر احسن، معین الدین جینا بڑے، خالد جاوید، سید محمد اشرف، صدیق عالم اور شمس الرحمٰن فاروقی کے شہ پاروں سے زندہ رہے گا بقیہ ادب میں تو پیش گوئیوں کی کوئی قیمت ہوتی ہے؟

اکرم نقاش : کوئی ادیب یا فن کار ایسا ہے جس نے آپ کو متاثر کیا ہو؟ غیر معمولی طور پر۔

اکرام باگ : میں غالب سے ہمیشہ ہی متاثر رہا ہوں۔ پھر وقفہ وقفہ سے مجھے منیر نیازی، نیر مسعود اور خلیل مامون نے متاثر کیا ہے۔ مجھے غلام عباس کا انداز بھی بے حد متوجہ کرتا رہا ہے۔

اکرم نقاش : تصوف سے آپ کو رغبت رہی ہے۔تصوف آپ کی نظر میں کیا ہے؟ عقلیت پسندوں کے لیے اس ضمن میں آپ کا کیا جواب ہوگا؟

اکرام باگ : ایک زمانے تک میں نے صوفیوں کے کوچوں کی سرگردانی کی ہے۔میری عمر کے چند سال اسی سرگرمی کی نذر ہوگئے۔میرے عزیز دوست خورشید وحید، عثمان بغلی بھی ان کوچوں کی سیر کرتے ہوئے نکل گئے۔انھوں نے کیا سمجھا اور انھیں کیا ملا اس کا جواب وہ

نہیں دے سکے۔ میرے دو تین افسانوں میں بالخصوص ''تقیہ بردار'' میں تین صوفیوں اور ایک سالک کی داستان بیان ہوئی ہے۔ اسی سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ میں نے تصوف کو کس زاویے سے دیکھا اور سمجھا ہے۔ میرے خیال میں تصوف وجود اور ماسوا وجود کو سمجھنے کا نام ہے اور اس منزل پر حضور کی ذات سرِ وجود کا آخری پڑاؤ ہے۔ عقلیت پسندوں (بہت خوب!!) کو تو فنا کی دہلیز کے مشاہدے سے ہی عقل ٹھکانے لگ جانے کا احساس ہوتا ہے۔

اکرم نقاش : گلبر گہ کے ادبی منظر نامہ پر آپ کی رائے جاننا چاہوں گا خصوصاً 60ء کے بعد کی صورتِ حال؟

اکرام باگ : بھئی گلبر گہ کے ادبی منظر نامے پر میں نے اشاروں ہی اشاروں میں بہت سی باتیں بیان کردی ہیں۔ گلبر گہ کا پرابلم یہ ہے کہ یہاں کے شعرا اور افسانہ نگار کوئی محدود قسم کا ادبی کارنامہ انجام دینے کے بعد اپنا فوکس مقامی اسٹیج میں نمایاں کرنے میں جٹ جاتے ہیں اور اسی کا حصہ ہو کر ختم ہو جاتے ہیں۔ اس شبھ کام میں جدید، مابعد جدید اور روایتی قسم کے فن کار یکساں ذہنیت کے حامل ہیں۔ دراصل ان ادیبوں کی سنگت ایسے افراد میں اُلجھ کر رہ جاتی ہے جن کا وصف شعر و ادب سے نہ ہو کر سیاسی، معاشی اور معاشرتی منفعت، کسی نہ کسی طریقہ سے حاصل کرنا ہوتا ہے۔ آج مجھے یاد آرہا ہے کہ جب میرا پہلا افسانہ شائع ہوا تو خمار قریشی نے مجھے حمید الماس سے ملایا تھا۔ تب تک الماس صاحب پر ایک طرح کی خاموشی طاری تھی.... مگر وہ گلبر گہ کی سبھا سنگت سے اپنے آپ کو دور رکھے ہوئے تھے اور نہ ہی انھیں کسی اسٹیج کی طرف لپکتے دیکھا۔ میری ان سے ہر روز ملاقات ہوتی رہی۔ یہ سلسلہ غالباً تین سال تک چلتا رہا بعد میں وہ بنگلور منتقل ہو گئے۔ میں نے ان کی سنگت میں بہت کچھ سیکھا جو میں محض مطالعہ سے سیکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنے ادبی نظریات، تجربات اور ادبی سیاسیات پر گھنٹوں گفتگو کرتے۔ میں نے بھی انھیں جدید رجحانات اور جدید ادب کی طرف مائل کرنے کی سعی کی۔ بالآخر وہ پھر سے شاعری کی طرف راغب ہوئے اور آخیر عمر تک اپنی بہترین تخلیقات خلق کرتے رہے۔ مجھے آج بھی اپنی اس سعی سے سکون ملتا ہے۔ آج گلبر گہ میں ایسے افراد جمع ہو گئے ہیں جو کسی شاعر اور افسانہ نگار کی خاموشی کا جشن مناتے ہیں اور طمانیت کی سانس لیتے ہیں۔ آج گلبر گہ کے ادبی منظر نامہ میں ایسے

تخلیق کاروں کا انبوہ ہے جن کے سروں پر ناقد، اسٹیج ساز اور مرتب کے بھوت سوار ہیں۔

اکرم نقاش : تو کیا آپ کی رائے سے یہ باور کیا جانا چاہیے کہ گلبرگہ میں کوئی ادیب شاعر یا افسانہ نگار ایسا پیدا نہ ہوا چاہے وہ جدید ہو کہ قدیم جس نے ادب میں کوئی اہم کام کیا ہو (کارنامہ تو بڑی بہت بڑی بات ہے) یا جس کا کام قابلِ ذکر یا قابلِ لحاظ ہو؟ آپ نے کہا کہ آج گلبرگہ میں ایسے افراد جمع ہو گئے ہیں جو کسی شاعر یا ادیب کی خاموشی کا جشن مناتے ہیں۔ اگر یہ بات سچ ہے تو میرا خیال ہے جشن منانا سوگ منانے سے بہتر کارگزاری ہے۔ اور اگر جشن سے آپ کی مراد یہ ہے کہ ان شاعروں اور ادیبوں کی خاموشی کو یہ گروہ اپنی کامیابی سمجھتا ہے تو یہ بات بھی ملحوظِ خاطر ہونی چاہیے جیسا کہ آپ کا خیال ہے کہ یہاں کوئی اہم ادبی کام نہ ہو سکا تو یہ گروہ جشن منائے کہ سوگ کیا فرق پڑتا ہے؟

اکرام باگ : آپ کی یہ بات کہ جشن ہو کہ سوگ دونوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا، قابلِ فہم ہے۔ بات یہ ہے اکرم نقاش صاحب کہ 1985ء کے بعد آپ کے علاوہ گلبرگہ میں اور کوئی نیا نام ملکی سطح پر اپنی شناخت قائم نہیں کر سکا ہے اور یہ بالخصوص آپ کے لیے اور بالعموم ہم سب کے لیے تشویش ناک بات ہے۔

اکرم نقاش : بہ ہر حال آپ کے خیال سے کم از کم میرا اتفاق مشکل ہے۔

اکرم نقاش : کبھی آپ کو کہتے سنا تھا کہ کہانی اور افسانہ تکنیکی اعتبار سے مختلف ہیں کیا آپ وضاحت کریں گے؟

اکرام باگ : اس کا ایک سیدھا سادہ جواب تو یہ ہے کہ کہانی تو افسانے کا ایک عنصر ہے مگر عمومی طور پر افسانے اور کہانی کو ایک ہی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ فاروقی صاحب نے ایک نکتہ اور نکالا کہ کہانی کو آپ زبانی سنا سکتے ہیں اور افسانہ زبانی سنایا نہیں جا سکتا۔ ان تمام امور کو آپ فاروقی کے مضامین میں تلاش کر سکتے ہیں۔

اکرم نقاش : تجربہ پسندی کے فروغ میں شب خون کا کیا رول رہا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ شب خون کے دروازے ہر تجرباتی تحریر کے لیے وا تھے۔ جب جدیدیت کی شدت پسندی جو ارتقائی دور میں تھی اعتدال پر آنے لگی تب بہت سے ایسے قلم کار جو جدیدیت کے آغاز میں متواتر لکھ رہے تھے ان کا قلم یکلخت سست روی کا شکار نظر آنے لگا۔ اگر شب خون جیسا رسالہ نہ ہوتا تو کیا تجریدیت سے بھری تحریریں منظرِ عام پر آتیں؟

اکرام باگ : خاموشی.....! ●●

خالد جاوید

نام : خالد جاوید

پیدائش : 19/مارچ 1963ء بریلی، اتر پردیش

تعلیم : ایم اے(فلسفہ)، ایم اے، پی ایچ ڈی (اُردو)

مصروفیت: اسسٹنٹ پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔

تصانیف : 1) برے موسم میں (کہانیاں) 2000

2) آخری دعوت (کہانیاں) 2007

3) تفریح کی ایک دوپہر (کہانیاں) 2008

4) موت کی کتاب (ناول)2011

5) نعمت خانہ (ناول) 2014

6) گابریل گارشیا مارکیز (تنقید)

7) میلان کنڈیرا (تنقید)

8) ستیہ جیت رے کی کہانیاں (ترجمہ)

9) کہانی، موت اور آخری بدیسی زبان (مضامین)

انعامات واعزازات: 1) کتھا ایوارڈ برائے ''برے موسم میں'' 1997

2) اوپیندر ناتھ اشک ایوارڈ برائے ''ہذیان'' 1998

3) اتر پردیش اکیڈمی ایوارڈ برائے ''موت کی کتاب''

بیشتر کہانیوں کا ترجمہ ہندی، انگریزی اور دیگر علاقائی زبانوں میں ہو چکا ہے۔

رابطہ : 09810596212

خالد جاوید سے ایک مکالمہ

اکرم نقاش : کہانی اور افسانہ لغوی اعتبار سے ہم معنی الفاظ ہیں۔فنی اعتبار سے کہانی اور افسانے میں بنیادی فرق کیا ہے؟ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ یہ کہانی ہے افسانہ نہیں۔ یا یہ کہ یہ افسانہ ہے کہانی نہیں آپ کا کیا خیال ہے؟

خالد جاوید : ذاتی طور پر میں کہانی اور افسانے میں کوئی فرق نہیں سمجھتا، دونوں ایک دوسرے کے مترادف ہیں، انگریزی میں جسے Short Story کہا جاتا ہے، اُسی کو آپ کہانی یا افسانہ کہہ سکتے ہیں۔اگر بال کی کھال نکالنے بیٹھ جائیں تو یہ ہے کہ کہانی زبانی بیانیہ ہے اور افسانہ تحریری بیانیہ یا یہ کہ کہانی سنائی جا سکتی ہے مگر افسانہ پڑھا جاتا ہے سُنایا نہیں جا سکتا۔یعنی قصّے، کہانیاں، حکایات، Fablis اور Parables ایک زمرے کی چیزیں ہیں اور افسانہ تحریری بیانیہ ہونے کے باوصف ان سے مختلف ہے،جس طرح ناول، داستان سے مختلف ہے۔مگر حقیقت یہ ہے کہ کہانی اور افسانے کو آج ایک ہی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔اگر یہ کہا جائے کہانی میں افسانے کے مقابلتاً سادگی ہوتی ہے اور وہ زیادہ Convincing ہوتی ہے، تو یہ بات اس لئے مناسب نہیں کہ جدید دور کی کہانی سادہ نہیں ہو سکتی۔ وہ زمانہ اور تھا جب انسان اور فن کے درمیان کوئی دوئی، کوئی خلیج نہیں تھی، ہر کہانی کی قاری یا سامع تک ترسیل ہو جاتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ فن کی تفہیم وتعبیر کے لئے نقاد نام کی کسی شئے کا وجود نہیں تھا۔مگر زندگی جیسے جیسے پیچیدہ ہوتی چلی گئی تو نقاد کی

ضرورت دونوں کے بیچ میں آن پڑی۔اس لئے اب کہانی میں وہ سادگی نہیں رہ سکتی جو ایسوپ کی کہانیوں میں تھی۔ بالزاک نے نپولین کے بارے میں فرانس میں مشہور جن دو لوک کتھاؤں کو اپنی زبان میں لکھا ان میں خاصی پیچیدگی، گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے ،یہی معاملہ انتظار حسین اور دلان وجے دھان دتیا کا ہے۔لہٰذا میرے ناقص خیال میں آج کے دور میں کہانی اور افسانہ کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کیا جاسکتا۔بس یہ ہے کہ آپ کوکون سا لفظ استعمال کرنے کی عادت پڑ گئی۔

اکرم نقاش : آپ کے بیش تر افسانوں کے مرکزی کردار بیمار،شوگر کے مریض،پیچش زدہ، بلڈ پریشر کا شکار، ٹائفائیڈ میں مبتلا اور آسیب زدہ بھی ہیں اور حلیے بشرے سے بدہیت نہ سہی نا قابل قبول خدوخال ضرور رکھتے ہیں یہ سب کہانی کی ضرورت ہوتی ہے یا کوئی نفسیاتی مسئلہ اس کے پیچھے کارفرما ہے کہ آپ کی کہانیاں اس طرح کے کردار مانگتی ہیں؟

خالد جاوید : یہاں میں خود پلٹ کر ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ اگر اس قسم کے کرداروں یا اشیا کو فکشن میں جگہ نہیں ملے گی تو پھر کہاں ملے گی؟ شاعری تو ان چیزوں کو دیکھ کر اپنی ناک پر رومال رکھ لیتی ہے، اگر فکشن میں بھی جمالیاتی حظ کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے تو یہ ایک بنیادی غلطی ہے۔میں اپنے فکشن کے ذریعے قاری کو ڈسٹرب کرنا چاہتا ہوں۔ادب کا اصل کام ضمیر کے دھول بھرے دروازے پر لگا تار دستکیں دینے کا ہے، جب کہ ادب کو زیادہ تر لوگ محض جمالیاتی انبساط حاصل کرنے کے لیے پڑھتے ہیں۔ میں اُس جمالیات پر ہی سوالیہ نشان لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔فن پارے کی جمالیات یا شعریات،فن پارے کی اوپری سطح پر حُسن کی تہیں چڑھانے سے نہیں تعمیر ہوتی۔ وہ تو بیانیے کے الجھے ہوئے دھاگوں اور اُس کے باریک رگ وریشوں میں شامل ہوتی ہیں۔یہ بہت عام بات ہے شبلی نے کہا تھا کہ چھپکلی کو دیکھ کر کراہت ہوتی ہے،مگر ایک مصوّر جب اُس چھپکلی کی ہو بہ ہو تصویر بنا کر رکھ دیتا ہے تو یہ اُس کے فن کا حُسن ہے۔حیرت ہے کہ ادب اور خاص طور پر فکشن میں لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں جب کہ بدصورتی کی گھٹّی پی کر ہی خوب صورتی کا جنم ہوتا ہے۔

اکرم نقاش : اسی سوال کی ایک کڑی کے طور پر میں آپ کے فن پر مقدر حمید صاحب کی بات دہرانا چاہوں گا کہ ''ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے تم نے زندگی میں ایسا کیا دیکھ لیا کہ زندگی کے روشن پہلوؤں پر تمہاری نظر نہیں پڑتی''کسی قلم کار سے یہ پوچھنا کہ وہ اس طرح کیوں لکھتا ہے ایک احمقانہ سوال ہے۔لیکن اس کے اس طرح لکھنے کی توجیہہ اور تاویل ضرور دریافت کی جاسکتی ہے۔تفصیل سے بتائیں؟

خالد جاوید : میں دوسروں کو خوش کرنے کے لئے نہیں لکھ سکتا اور نہ ہی اُن کے لئے جمالیاتی حظ حاصل کرنے کا وسیلہ بن سکتا ہوں۔ زندگی کے روشن پہلو دکھانے کا کام سیاست دانوں اور سرمایہ کاروں کا ہے،ادیبوں اور فن کاروں کا نہیں۔اردو افسانے میں روشن پہلوؤں کا ذکر کچھ زیادہ ہی شدومد کے ساتھ کیا جاتا ہے مگر ساری دُنیا کے فکشن پر نظر ڈالیں تو اس قسم کے اعتراضات کی نوعیت بڑی بچکانہ نظر آتی ہے۔اسپین کے مایہ ناز ادیب سروینٹس کے ناول''ڈان کیہوتے''کو فکشن کا عظیم ترین نمونہ مانا جاتا ہے۔اسے دُنیا کا پہلا ناول بھی کہا جاسکتا ہے(حالانکہ اُس وقت تک ناول کا لفظ وجود میں نہیں آیا تھا)۔اس ناول کے ہیرو''ڈان کیہوتے''کو آپ کس قسم کا کردار کہیں گے؟۔اُس کا حُلیہ،اُس کے اعمال،اُس کی کیفیات اور اُس کی ذہنی بیماری وغیرہ کو آپ کس درجے میں رکھیں گے؟ یہ ایک ابنارمل کردار ہے مگر فکشن کی دُنیا کا لازوال کردار بن گیا ہے۔جو لوگ ڈان کیہوتے کو ایک مزاحیہ ناول سمجھ کر پڑھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔وہ ایک قسم کی بلیک کامیڈی ہے جو اندر سے بے حد سنجیدہ اور افسردہ ہوتی ہے۔چلئے چھوڑئے،دوستوئفسکی کے کرداروں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کمزور،بیمار،افسردہ،مرگی کے شکار کردار! مگر سمجھ دار قاری دوستوفسکی پر اس قسم کے بچکانہ اعتراض کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا۔جرمن ناول نگار ٹامس مان کا بھی یہی معاملہ ہے۔آگے چل کر کافکا ہے یہ عظیم مصنف کس قسم کی دنیا ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اور کس قسم کے کرداروں سے اس عجیب وغریب دُنیا کی تشکیل ہوتی ہے؟اردو میں ناول کی پیدائش کو صرف ڈیڑھ سو سال کا عرصہ گذرا ہے اور افسانے کو بہ مشکل ایک سو پندرہ سال کا۔ ہمارے یہاں قاری کی ساری تربیت زیادہ تر شاعری میں صرف ہوتی ہے،ہمارے بہترین ناقد بھی شاعری پر توجہ صرف کرتے رہے ہیں،اور یہ بھی ہے کہ

ہمارے یہاں جس پائے کی شاعری ہوتی ہے خاص طور پر غزل کی شاعری اُس پائے کا فکشن نہیں لکھا گیا۔ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور فیضؔ ایک سانس میں آپ آٹھ دس نام گنا سکتے ہیں مگر ناول اور افسانے میں؟ پریم چند، منٹو، بیدی، قرۃالعین حیدر، عبداللہ حسین اور انتظار حسین ۔ یہ سب ہمارے بہت ہی عمدہ اور اعلٰی درجے کے فکشن نگار ہیں مگر جب عالمی تناظر کی بات ہوتی ہے تو میر اور غالب اور اقبال کو شیکسپیر، دانتے، گیٹے کسی کے ساتھ بھی کھڑا کر دیجئے فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے گا، مگر یہی بات عالمی فکشن کے تناظر میں نہیں کہی جا سکتی۔ اس امر کی بہت سی وجوہات ہیں جن کی تفصیل میں جانا سر دست مناسب نہیں۔ بہ ہر حال کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اپنے اوپر کیے گئے ان اعتراضات کی تُک نہیں سمجھ میں آتی اور میں ان کی کوئی پرواہ بھی نہیں کرتا اپنے افسانوں کے مجموعے ''آخری دعوت'' اور اپنے ناول ''موت کی کتاب'' کے دوسرے ایڈیشن کے پیش لفظ میں، میں اپنے موقف کا کھل کر اظہار کر چکا ہوں۔ میں نے یہی باتیں دُہرائی ہیں اور اب میرا خیال ہے کہ ان باتوں کو کبھی نہیں دُہراؤں گا بس اتنا کہہ کر اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ نارمل اور صحت مند کرداروں پر مبنی کوئی افسانہ لکھا ہی نہیں جا سکتا، فکشن کی تعمیر اُن ہی کرداروں کے ذریعے ہوتی ہے جن پر ہنس بھی سکیں اور رو بھی سکیں، کیوں کہ زندگی کا بہ ذات خود یہی کردار ہے۔

اکرم نقاش : ''کفن پریم چند کی حسیت کا وہ ہتھوڑا ہے جس کی دھمک ہر جدید افسانوی دماغ میں سنائی دیتی ہے اور جس سے کوئی افسانوی دماغ نہیں بچ سکا ہے۔'' فضیل جعفری صاحب کے اس خیال سے آپ کس حد تک اتفاق کرتے ہیں؟

خالد جاوید : میں تنقید نگاروں کے اقوال زرّیں کا محاسبہ کرنے کا اہل نہیں، کفن ایک شاہ کار ہے، اردو افسانے کا شاہ کار، اس میں تو کوئی شک ہی نہیں مگر افسانے کی ایک محدود دُنیا ہوتی ہے۔ افسانہ ایک وسیع و بے کراں تاریک میدان میں دیا سلائی جلا کر میدان کے ایک بہت چھوٹے سے حصے کو دیکھنے کا نام ہے۔ جہاں جہاں دیا سلائی جلائیں گے، آس پاس کا تھوڑا سا حصہ کچھ کچھ روشن ہو جائے گا، وہ بھی اُس وقت تک جب تک دیا سلائی بجھ نہیں

جاتی۔کوئی افسانہ نگار اپنی تخلیقی ترجیحات اور اپنے محدود تجربوں کی بنا پر دوسرے افسانے بھی لکھ سکتا ہے۔ایسے افسانے جن پر کفن کا کوئی اثر نہ ہو، یا کوئی افسانوی دماغ وجدید؟؟ کفن کے اثر سے قطعاً آزاد ہو۔کفن کوئی آفاقی تجربہ تو تھا نہیں اور نہ ہی اُسے ہونا چاہئے ورنہ وہ خراب ہو جاتا۔ ہر فن پارہ اضافی ہوتا ہے اس سے کسی مطلق صداقت کی نمائندگی نہیں ہوتی۔تنقید نگار اکثر اس قسم کے فیصلے صادر کرتے ہیں مگر تخلیقی ذہن بے حد پیچیدہ اور پُراسرار ہوتا ہے۔تخلیق کے محرکات اُس سے بھی زیادہ پیچیدہ اور پُراسرار ہوتے ہیں۔ اُس پر منطقی قسم کے قضایا کا اطلاق مشکل سے ہی ہوسکتا ہے۔

اکرم نقاش : وارث علوی صاحب کا یہ کہنا کہ ''مجھے جدید افسانہ پسند نہیں، نہایت اوسط درجے کے لکھنے والے پیدا ہوئے ہیں اکثر تو بالکل فراڈ ہیں۔ اسلوب ان کے لیے اپنی Mediocrity کو چھپانے کا نقاب بن چکا ہے'' یا انہی کا یہ قول کہ ''انتظار حسین اور انور سجاد جانے کس دنیا کی باتیں کرتے ہیں میں ان کی باتیں سمجھ نہیں سکتا۔'' ان خیالات کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

خالد جاوید : بات یہ ہے اکرم صاحب کہ موضوع اپنا بیانیہ اور اپنا اسلوب ساتھ لے کر آتا ہے، جدید افسانے کے موضوعات وہ نہیں تھے جو رومانی، اصلاحی اور ترقی پسند افسانے کے تھے۔اس لئے اگر جدید افسانے کی مبادیات کو سمجھے بغیر اُس کا موازنہ ترقی پسند افسانے سے کیا جائے گا تو ان اقسام کے افسانوں کے ساتھ انصاف کی گنجائش کم ہو جاتی ہے۔کبھی کبھی یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ ہمارے یہاں وہ معاشی، سیاسی یا جذباتی مسائل پیدا ہی نہیں ہوئے جن کا آئینہ دار جدید افسانہ تھا اور یہ صرف مغرب کی تقلید تھی، مگر ذرا رک کر اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ وجودی مسائل کا تعلق انسان کی ذات سے ہے۔ یہ مسائل کم و بیش ہر زمان و مکان میں ایک جیسے ہیں۔ایران میں جدید فارسی افسانہ جس طرح پنپا اور مقبول ہوا وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ ہندوستان کی زبانوں مثلاً کنڑ، اوڑیا اور تیلگو میں بھی اعلیٰ درجے کے جدید افسانے لکھے گئے، مگر مسئلہ یہ ہے کہ جب آپ کسی رجحان یا فیشن کے تحت لکھتے ہیں، اگر بغیر کسی جینوین تخلیقی تجربے کے آپ لکھتے ہیں اور ایسا بہت ہوا

تو جو افسانہ سامنے آتا ہے وہ یقیناً وہی افسانہ ہے جسے وارث علوی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔نقالی سوائے ناکامی کے اور کچھ نہیں دے سکتی، بے چارہ جدید افسانہ ہی کیوں، پریم چند،منٹو،کرشن چندر،قرۃالعین حیدر،عصمت چغتائی اور بیدی کے نقالوں کو نہ تب کوئی یاد رکھتا ہے اور نہ اب، جب کہ اپنے زمانے میں بہت سے اوسط درجے کے لکھنے والوں نے اِن سب کے اسلوب اور موضوع دونوں کی نقل کرنے کی کوشش کی ہے، مگر Mediocraty کو کسی نقاب کے ذریعہ نہیں چھپایا جا سکتا، ہاں مگر انتظار حسین اور انور سجّاد ہمارے بہت معتبر لکھنے والے ہیں۔ان میں آپ سریندر پرکاش، خالدہ حسین، غیاث احمد گدی اور بلراج مین را کے نام بھی شامل کر سکتے ہیں۔ اِس لئے میرے خیال میں ان لوگوں کے بارے میں وارث علوی کی رائے زیادتی پر مبنی ہے۔ ویسے آگے چل کر انتظار حسین کے تعلق سے وارث علوی کے سخت تنقیدی روئے میں لچک پیدا ہوئی تھی۔کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ذاتی پسند یا ناپسند بھی تنقید کی معروضیت کو متاثر کرتی ہے۔

اکرم نقاش : وارث علوی، گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی سے قطع نظر فکشن کی تنقید میں پچھلے پچیس تیس برسوں میں کیا ایسی تنقیدی تحریریں سامنے آئی ہیں جو فکر انگیز رہی ہوں اور جن سے افسانے کی مبادیات اور اس کی افہام وتفہیم میں مدد ملی ہو اور جن سے بحث کے دروازے کھلے ہوں؟

خالد جاوید : ان لوگوں میں آپ شمیم حنفی کا نام بھی شامل کر لیں، انتظار حسین، قرۃالعین حیدر اور نیر مسعود پر شمیم حنفی نے جو مضامین لکھے ہیں وہ افسانے کی تفہیم وتعبیر کا ایک نیا در وا کرتے ہیں۔ اگر یہ مضامین نہ لکھے جاتے تو افسانے کے حوالے سے بہت سے گوشے ہماری نظروں سے اوجھل ہی رہتے، شمیم حنفی کے علاوہ مظفر علی سید، قاضی افضال حسین، عتیق اللہ اور آصف فرخی کے کچھ مضامین بھی اس سلسلے میں حوالہ بن سکتے ہیں۔

اکرم نقاش : جدید افسانہ نگاروں میں بالخصوص 1960 سے 1980 تک کے عرصہ میں جو افسانہ خلق ہوا ان میں ایسے کتنے افسانہ نگار ہیں جو دیر تک یاد رکھے جائیں گے؟ اور کیوں؟

خالد جاوید : قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، سریندر پرکاش، عبداللہ حسین، انور سجاد اور خالدہ حسین۔ آپ نے ساٹھ سے اسّی کی قید لگا دی ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ میں اس میں کسی اور کا نام اضافہ نہیں کر سکتا۔ قرۃ العین حیدر نے انسان کی اجتماعی زندگی کو وقت اور کائنات کے ایک Metaphysical اور Metahistorical تناظر میں جس فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انتظار حسین نے ہجرت کے وجودی تجربے اور علامت کو بہت اچھوتے انداز میں اپنے افسانوں میں استعمال کیا ہے۔ انھوں نے تمثیل کی نئی جہات بھی دریافت کی ہیں، ان کے افسانے انسان کے ذہنی، جذباتی اور اجتماعی مسائل کے عکاس ہیں، ان کا بیانیہ ناقابل تقلید ہے۔ سریندر پرکاش، انور سجاد، اور خالدہ حسین نے بھی علامتی تجریدی کہانیاں لکھیں ہیں۔ علامت کو اور تجریدیت کو افسانہ کیسے بنایا جا سکتا ہے، یہ کوئی ان لوگوں سے سیکھے۔ انور سجاد کا کمال یہ ہے کہ ان کی کہانیاں سیاسی جبر کے خلاف ایک احتجاج بن گئی ہیں، علامتی اور تجریدی بیانیے میں یہ کام جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ مواد اور بیانیے پر ایک ساتھ، ایسی مکمل گرفت مجھے کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتی۔ عبداللہ حسین کی شہرت زیادہ تر ان کے ناول ''اُداس نسلیں'' کے حوالے سے ہے۔ مگر انھوں نے چار پانچ کہانیاں ایسی لکھی ہیں جو ناقابل فراموش ہیں۔ ''سات رنگ'' کے نام سے عبداللہ حسین کی کہانیوں کا مجموعہ شائع ہوا اسے اردو افسانے کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ عبداللہ حسین کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے حقیقت پسند بیانیے کے نئے امکانات کو کھنگالا ہے اور اس کی نئی جہات دریافت کی ہیں بغیر کسی علامت یا استعارے کے انھوں نے فرد کو اس کے وجودی تناظر میں جس خوبی اور شدت کے ساتھ پیش کیا ہے اس کی کوئی دوسری مثال دیکھنے کو نہیں ملتی۔

اکرم نقاش : آپ کا ناولٹ ''موت کی کتاب'' پڑھ کر احمد ہمیش کی کہانی ''ڈرینج میں گرا ہوا قلم'' کی بے ساختہ یاد آ جاتی ہے۔ کیا یہ اتفاق ہے کہ مکھی کے افسانوں کی سی Darkness کا پرتو آپ کے ہاں بھی جھلکتا ہے؟

خالد جاوید : ڈرینج میں گرا ہوا قلم ایک علامتی کہانی ہے، احمد ہمیش کی کہانیوں کی Darkness ایک

علامت ہے۔ میں بالکل دوسرے قماش کا لکھنے والا ہوں۔ میرے یہاں Darkness صرف Darkness ہی ہے، حقیقی اور ٹھوس۔ میرے اس بیان کے بعد بھی اگر کوئی یہ کہے کہ احمد ہمیش کے افسانوں کا پرتو میرے یہاں جھلکتا ہے تو میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں، اس بات کو بھی مدنظر رکھنا چاہیئے کہ دُنیا میں کوئی خیال ایسا نہیں ہے جو کسی کو پہلی بار آیا ہو، ہر بات، اگر لکھی نہیں گئی تو دنیا میں کسی نہ کسی کے ذریعے سوچی ضرور جا چکی ہے، ادب کی دنیا میں بالکل نیا کچھ نہیں ہوتا۔ احمد ہمیش مجھ سے بالکل مختلف افسانہ نگار ہیں، میرے افسانوں کو ان کے افسانوں سے کوئی علاقہ نہیں اگر چہ کوئی تنقید نگار اسے ثابت کر سکتا ہے اور میں کیا کوئی بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

اکرم نقاش : افسانوں کی ایک سی فضا کرداروں کے افعال میں یکسانیت، بیانیہ کی خاص نہج اسلوب کے قائم کرنے میں مدد تو کرتی ہے لیکن قاری کو تنوع کی کمی کا احساس بھی ہوتا ہے، کیا متنوع طرز اظہار اسلوب کے قائم کرنے میں حارج ہوتا ہے؟

خالد جاوید : ہر کہانی کار ہمیشہ ایک ہی کہانی لکھتا ہے، نئے نئے مکھوٹے لگا کر وہ بار بار اسٹیج پر آتا ہے۔ سچے فن کار کے پاس کہنے کے لیے ایک ہی بات ہوتی ہے، صرف زمان و مکان بدل جاتے ہیں، واقعہ بدل جاتا ہے، صورت حال تبدیل ہو جاتی ہے مگر زیریں سطح پر سب کچھ ایک ہی رہتا ہے اور وہی اصل ہوتا ہے۔ انگریزی کی ایک کہاوت ہے Style is the mother ۔ ہم دوستوئفسکی، کافکا، انتظار حسین یا نیر مسعود وغیرہ کو اس امید کے ساتھ پڑھتے ہیں کہ ان کے یہاں وہ ملے گا جو ان کا اپنا اورنجی ہے۔ ہم کافکا کے یہاں ڈی ایچ لارنس یا فلا بیر کی دنیا کی توقع نہیں کر سکتے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایک ہی ادیب کے یہاں تنوع کیسے مل سکتا ہے، تنوع کو ادب کی کسی عمومی یا مجموعی صورت حال میں تو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ بازار کے تقاضوں کے تحت مقبول عام ادب لکھنے والے لوگوں کا بھی بہ ہر حال اپنا ایک اسٹائل ہوتا ہے۔ اپنی زبان ہوتی ہے اور کرداروں کا ایک خاص رویہ ہوتا ہے جس پر مبنی ان کا بیانیہ آگے بڑھتا ہے، تنوع کے اگر یہ معنی ہیں کہ ادیب اپنی شناخت کھو بیٹھے اور اپنے تخلیقی رویّے اور مزاج میں بالکل مختلف ہو جائے تو میں ایسے

تنوع کا قائل نہیں۔آپ اپنے کمرے میں ادھر پڑا صوفہ اور کرسیاں اُدھر تو ڈال سکتے ہیں مگر ہر ہفتے نیا صوفہ اور کرسیاں لا کر نہیں ڈال سکتے اور اگر آپ ایسا کرتے ہیں ایک بے حد نمائشی، چھچھورے اور احساس کمتری سے مملوعمل سے دوچار ہوتے ہیں۔فکشن نگار کوئی اداکار نہیں ہے حالاں کہ بڑے اداکار کا خود اپنا ایک اسٹائل ہوتا ہے اور اس کی اپنی ترجیحات اور اپنی حدود ہوتی ہیں۔اس قسم کا اوپری سطح کا تنوع کسی بھی ادیب کے یہاں صرف عدم توازن کا باعث بن سکتا ہے۔

اکرم نقاش : ''کہانی کی واپسی'' یہ جملہ قریب قریب اصطلاح بن چکا ہے۔کیا آپ سمجھتے ہیں کہ واقعی کہانی ہم سے کھوگئی تھی؟ کیا جدیدیت کے ارتقائی دور میں اور 1975 تا1980 تک بھی جو افسانہ خلق ہوا اگر وہ کہانی نہیں ہے یا افسانہ نہیں ہے تو اسے ہم کس خانے میں رکھیں گے؟

خالد جاوید : میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کہانی آخر کس سفر پر نکل گئی تھی جہاں سے اب واپس ہوئی ہے؟ ہر عہد کا اپنا ایک بیانیہ ہوتا ہے آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ 1960 سے 1980 کے درمیان کا بیانیہ اس طرح کا تھا اور اُس سے پہلے دوسرے قسم کا۔اِس قسم کی افواہیں اسی وقت اڑائی جاتی ہیں جب قاری بہت سہل پسند ہوگئے ہوں اور Mediocre قسم کے ادیب اور تنقید نگار ایسی افواہوں کو ہوا دیتے ہیں کیوں کہ اس میں ان کا مفاد پوشیدہ ہوتا ہے۔اگر کہانی پن کے سطحی معنی پر زور دیا جائے تو پریم چند کے یہاں بھی کہانی نہیں ملے گی۔کہانیاں تو صرف پچیسی میں ملیں گی،اس طرح تو ''کفن'' میں اور جو ہو تو ہو، کہانی تو ہے نہیں، بھلا اس میں کیا کہانی ہے کہ گھیسو اور مادھو آلو بھون بھون کر کھاتے جا رہے ہیں اور کہانی آگے بڑھتی ہی نہیں، کچھ ہوتا ہی نہیں۔میں آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں کہانی تو صرف گلشن نندہ اور رانو وغیرہ کے پاس تھی،اور شاید ان ہی کے پاس سے واپس لوٹ کر 1980 کے بعد کے لکھنے والوں کے پاس آئی ہے۔آپ کے اس سوال کے جواب میں میرے پاس اور کچھ کہنے کو نہیں ہے۔

اکرم نقاش : ہندو پاک میں فکشن کی موجودہ صورت حال کیا ہے؟

خالد جاوید : اکرم صاحب۔ میرے خیال میں آپ کو یہ پوچھنا چاہیے کہ ادب کی صورت حال کیا ہے؟ دراصل یہ عہد ادب کے زوال کا عہد ہے، میڈیا اور بے لگام مادہ پرستی نے ادب اور اس کے فنّی نیز سماجی سروکاروں کو حاشیے پر ڈال دیا ہے بہ قول میلان کنڈیرا جو بھی تخلیق ہو رہا ہے اس کی نوعیت زیادہ تر Kitch کی ہے، یعنی بازاری اور سستا ادب، لہٰذا کیا ناول کیا افسانہ اور شاعری سب پر بُرا وقت آ پڑا ہے، اردو کا معاملہ اور خراب ہے، کوئی ذہین طالب علم مجبوری میں ہی اردو پڑھے تو پڑھے ورنہ سب سائنس، انجینئر نگ مینجمنٹ یا دوسرے سماجی علوم کی طرف نکل جاتے ہیں۔ اردو میں نئی نسل میں تخلیقی اذہان کی کمی ہے، اسی لیے قاری کا معاملہ بھی پست ہو گیا ہے۔ وہ افسانے اور صحافتی رپورٹ میں فرق کرنا نہیں جانتا چاہے مکتبی انداز میں آپ اسے افسانے کی ساری مبادیات رٹا ڈالیں، میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ایک مرکزی یونیورسٹی میں گذشتہ پندرہ سال سے اردو پڑھا رہا ہوں۔ جب کہ اس سے پہلے جب میں کالج میں فلسفے کا معلم تھا تو جو طلبا وہاں آتے تھے وہ ذہین بھی تھے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ انگریزی وغیرہ میں بھی صورت حال مختلف ہے۔ بہ ہر حال آپ کے سوال کے جواب میں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ فکشن کی مجموعی صورت حال یہاں اچھی ہے نہ پاکستان میں، مجھے یہ مایوس کن نظر آتی ہے۔

اکرم نقاش : آپ اپنے ہم عصروں میں کن کن افسانہ نگاروں کو پسند کرتے ہیں اور کیوں؟

خالد جاوید : ہم عصر افسانہ نگاروں میں شاید ہر ایک کے پاس کم از کم ایک یا دو اچھے افسانے ضرور ہیں۔ مشرف عالم ذوقی، پیغام آفاقی، غضنفر، طارق چھتاری، انجم عثمانی، محسن خان، سید محمد اشرف، خورشید اکرم اور صدیق عالم وغیرہ (نیر مسعود کو میں بہ وجوہ اپنا ہم عصر نہیں مانتا، مگر وہ بہت بڑے افسانہ نگار ہیں، اُن کے پائے کا کوئی دوسرا افسانہ نگار سنیئر یا جونیر دونوں میں فی الوقت کوئی نہیں ہے) ذاتی طور پر میں سید محمد اشرف، خورشید اکرم، صدیق عالم اور

پاکستان کے آصف فرخی اور مرزا حامد بیگ کو بے پناہ پسند کرتا ہوں ۔ایک بالکل نئے افسانہ نگار رضوان الحق بھی مجھے بہت پسند ہیں۔اشرف جس طرح اپنے ماحول کو کہانی بنا دیتے ہیں اُس میں اُن کا کوئی ثانی نہیں۔صدیق عالم نے شہر کی زندگی کو جس طرح اپنے تخلیقی تجربے کا حصہ بنایا ہے وہ کمال کا ہے۔صدیق عالم کا بیانیہ بے حد دبیز اور گھنا ہے،اس قسم کا بیانیہ صرف وہی لکھ سکتے ہیں۔دوسرا لاکھ کوشش کر کے بھی اُن کی تقلید نہیں کر سکتا۔خورشید اکرم نے فرد اور سماج کی کشمکش کو بالکل نئے انداز سے پیش کیا ہے،فردیت اور اجتماعیت کا جیسا فن کارانہ امتزاج خورشید اکرم کے یہاں پایا جاتا ہے وہ کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتا۔آصف فرخی کا بیانیہ بہت تہہ دار ہے،انھیں گہرے وجودی مسائل اور پاکستان کے معاشرے سے متعلق،سماجی اور سیاسی مسائل،دونوں کو بیان کرنے پر ملکہ حاصل ہے آصف فرخی نے علامتی کہانیاں بھی لکھی ہیں اور حقیقت پسند بیانیہ پر مبنی کہانیاں بھی،دونوں انداز کی کہانیوں پر انہیں یکساں عبور حاصل ہے زبان و بیان کا بھی جیسا سلیقہ آصف فرخی کو ہے وہ بہت کم افسانہ نگاروں کو نصیب ہے۔مرزا حامد بیگ بھی یوں تو شاید میرے ہم عصر نہیں مگر پاکستان کے تعلق سے آپ کے ایک سوال کو مدنظر رکھتے ہوئے میں ان کا نام بھی ہم عصروں میں شامل کر لیتا ہوں مرزا حامد بیگ نے علامت کو اور کہیں کہیں سرریلزم کو جس طرح اپنی کہانیوں میں سمویا ہے وہ میرے لیے حیران کن ہے۔علامت یا استعارے کے ساتھ ساتھ جزئیات پر غیر معمولی گرفت کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتی،ذاتی طور پر میں انھیں بہت پسند کرتا ہوں،یہاں میں بہ طور خاص شمس الرحمان فاروقی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ایک طرح سے وہ میرے ہم عصر ہی کہے جا سکتے ہیں کہ ان کے سارے افسانے جو سوار اور دوسرے افسانے نام کے مجموعے میں شامل ہیں وہ سب پندرہ بیس سال پہلے شب خون میں بنی مادھو،رسوا اور عمر شیخ مرزا کے نام سے شائع ہوئے تھے۔حقیقت یہ ہے کہ فاروقی صاحب کے ان افسانوں کا کوئی پیش رو نہیں ہے،فاروقی ان تاریخی،تہذیبی افسانوں اور ایک خاص قسم کے بیانیہ کے موجد اور خاتم دونوں کہے جا سکتے ہیں۔فاروقی کے ان افسانوں میں اُداسی اور اسرار کی تہہ بہت دبیز ہے،زمان و مکان کے ایک طویل اور دھندلے فاصلے پر مبنی ہونے کے باوصف کبھی کبھی یہ مجھے بورخیس کے گھنے پیچیدہ اور ملال انگیز بیانیہ کی بے ساختہ یاد دلاتے ہیں۔یہ محض انفرادی نوعیت کی چیز نہیں

بلکہ ایک پوری قوم اور تہذیب کے اجتماعی لاشعور اور نسلی حافظے سے تشکیل ہوئی حسیّت ہے، جس نے اس انوکھے بیانیے کو جنم دیا۔ فاروقی کے افسانوں کا بیانیہ جتنا بیانیہ ہے اس سے زیادہ ماورائے بیانیہ ہے۔ یہ امر بہ جائے خود بے حد حیران کن ہے کہ اردو کے اعلیٰ ترین نقاد کے منصب پر فائز ہونے کے باوجود افسانے کے کرافٹ پر غیر معمولی قدرت اُنھیں حاصل ہے جو فاروقی کو اردو کے اعلیٰ ترین فکشن نگار لکھنے والوں میں لا کر شامل کر دیتی ہے۔ شمس الرحمان فاروقی نے افسانے کی حمایت میں لکھ کر افسانے کی مبادیات کے حوالے سے پہلی بار اردو میں جہادی کارنامہ انجام دیا ہے۔ فاروقی نے پہلی بار ہمیں یہ بتایا کہ افسانہ کہتے کسے ہیں اس طرح انھوں نے جو فکشن لکھا اس کے ذریعہ ہم یہ بھی سیکھ سکتے ہیں کہ فکشن کیسے لکھا جائے۔ مگر میری پسند کی یہ فہرست اس امر کی ہرگز نمائندگی نہیں کرتی کہ جو نام اس فہرست میں شامل نہیں ہیں وہ اچھے افسانہ نگار نہیں یہ بالکل ذاتی پسند ہے۔ میں نقادوں کی طرح نہ کوئی حکم صادر کر رہا ہوں اور نہ کوئی معروضی فیصلہ سنا رہا ہوں، اس قسم کے سوالوں سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

اکرم نقاش : آپ شمیم حنفی سے بہت قریب رہے ہیں حنفی صاحب کی نثر اور فن پارے یا کسی موضوع کی تفہیم میں ان کے انداز کے بارے میں آپ سے جاننا چاہوں گا۔ عصری تنقید میں ان کا مقام آپ کی نظر میں کیا ہے؟

خالد جاوید : اصل بات یہ ہے کہ وجودی طرزِ احساس اور فکر نے شمیم حنفی کی تنقید کو جس طرح متاثر کیا ہے اس کی دوسری مثال اردو میں نہیں پائی جاتی آپ اس تنقید کو اک طرح سے آوٹ سائڈر کی تنقید کہہ سکتے ہیں۔ ان کی تنقیدی نگارشات پر وجودی احساسات اور کیفیات کی جو چھوٹ پڑی ہے وہ اس صداقت پر مبنی ہے جس کا خمیر انسانی وجود ہے۔ ہر بڑا ادب پارہ اپنے آپ میں ایک مابعد الطبیعیات بھی ہوتا ہے۔ نقاد کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ اس مابعد الطبیعیات کو دریافت کرے، مگر دریافت کا یہ عمل بہ جائے خود ایک گہرے وجودی احساس سے تعبیر ہے۔ دریافت کے معنی نقاد کے لیے نہ تو ٹوپی سے خرگوش نکالنا ہے اور نہ یہ اعلان کرنا کہ زمین سورج کے چاروں طرف گردش کرتی ہے۔ شمیم حنفی کی تنقید فن پارے

کی مابعد الطبیعات کو دریافت کرتی ہے اور پھر وہ سب کچھ جو دریافت ہوا ہے قاری کو نظر آنے لگتا ہے۔ وہ ایک زندہ احساس کی صورت میں ہمارے قلب میں جگہ پانے لگتا ہے۔شمیم حنفی کی تنقید 'تخلیق' کے ساتھ شرکت کرتی ہے۔ ہر فن پارہ اپنے پیچھے خون کی کچھ بوندیں چھوڑ جاتا ہے، شمیم حنفی کی تنقید خون کی ان بوندوں سے بنی ہوئی لکیر کے ساتھ ساتھ چلتی ہے، ایسی تنقید کی ایک خاصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ کبھی غیر تخلیق کے لیے وجود میں نہیں آسکتی، وہ کسی غیر تخلیقی تجربے کا نوٹس ہی نہیں لے سکتی۔آپ نے شمیم حنفی کی تنقیدی زبان کی بابت پوچھا ہے، ظاہر ہے کہ جن باتوں کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے ان کے اسباب زبان ہی میں پوشیدہ ہیں۔شمیم حنفی کی زبان کچھ جان لینے یا بتا دینے کی زبان نہیں ہے بلکہ اپنے ہونے کی زبان ہے، ایک بات اور یاد رکھنے کی ہے کہ ادب کا بھی معروضی مطالعہ، بغیر موضوعیت کو شامل کیے مکمل نہیں ہوسکتا، شمیم حنفی کے مطالعے کا مرکز صرف وہ تخلیقات ہوتی ہیں جن سے ان کا کوئی ذہنی رشتہ قائم ہوتا ہے، اس لیے فن پارے سے وہ ایک Vulgar scientist کی طرح بالکل بے تعلق رہ ہی نہیں سکتے۔تخلیق ایسی تنقید ہی کی محتاج ہوتی ہے جو اسے مکمل کردے، شمیم حنفی کی تنقید فن پارے کو مکمل کرنے کا فریضہ انجام دیتی ہے۔مکمل کرنے کے اس عمل میں تشریح و تفہیم کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے۔میرے خیال میں شمیم حنفی کی تنقید کا کوئی رول ماڈل اردو میں نہ تو پہلے کبھی تھا اور نہ ہی آج اس کا موازنہ دوسری تنقیدی تحریروں سے کیا جاسکتا ہے۔

اکرم نقاش : اردو زبان و ادب کا مستقبل آپ کی نظر میں کیا ہے؟ کیا آج ادب صرف ادب خلق کرنے والے ہی پڑھ رہے ہیں؟

خالد جاوید : میں شاید پہلے ہی اس کا جواب دے چکا ہوں، میرے خیال میں اردو زبان و ادب کا مستقبل بہت تابناک نہیں ہے ادب لکھا تو بہت جا رہا ہے بلکہ Produce بہت ہو رہا ہے، مگر اس کے معیار کے بارے میں مجھے شک ہے۔کتابیں بھی بہت چھپ رہی ہیں لیکن یہ سب کچھ اسی طرح ہے جیسے کوئی اپنی موجودگی درج کراتا ہے۔اردو زبان غلط سیاسی پالیسیوں کی وجہ سے گزشتہ ساٹھ برس سے لگاتار نقصان اُٹھا رہی ہے۔میرے

خیال میں اس وقت اردو زبان کے وجود کو بچانا بہت ضروری ہے۔ یہ رسم الخط وغیرہ بدلنے کی جو بات کہی جاتی ہے وہ دراصل اردو کو ختم کر دینے کی بہت بڑی سازش ہے یا پھر نا سمجھی۔ اور جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بتایا کہ ویسے تو ہر زبان وادب پر بُرا وقت آن پڑا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ فی الحال اردو زبان وادب کے مستقبل بارے میں، مجھے کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ آپ نے جو پوچھا کہ کیا صرف ادب خلق کرنے والے ہی ادب پڑھ رہے ہیں تو میرا جواب ہے کہ جی ہاں یقیناً ایسا ہی ہے اور وہ بھی اپنا خلق کیا ہوا ادب ہی پڑھتے ہیں یا اپنے بارے میں مضامین۔ حالت یہ ہے کہ رسالوں کو اُلٹی طرف سے پڑھے جانے کا رواج ہو گیا ہے تا کہ خطوط والے آخری صفحات میں یہ دیکھ سکیں کہ کہیں کسی بہانے سے ان کا نام آیا ہے یا نہیں۔ ایک ادیب کے یہاں خود پسندی یا نرگیست کا رجحان عام بات ہے مگر اب یہ رجحان ایک ذہنی بیماری بن گیا ہے، اس بیماری کا علاج ضروری ہے۔

اکرم نقاش : سکندر احمد سے مستقبل میں فکشن کی تنقید پر اچھی تحریروں کا امکان تھا۔ افسوس آج وہ ہم میں نہیں رہے۔ ان کی تنقید کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

خالد جاوید : یقیناً سکندر احمد نے فکشن کی عملی تنقید کے بہت اچھے نمونے پیش کیے ہیں، بیانیہ کے حوالے سے ان کے تحریر کردہ سارے مضامین ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے، افسانے میں کتنے بیان کنندہ ہو سکتے ہیں یا کہانی بیان کرنے والی کتنی آوازیں ایسی ہو سکتی ہیں جو بیانیے میں شامل ہوں وغیرہ وغیرہ سکندر احمد نے Narrative کی بہت سی جہات کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے، وہ میرے اچھے دوست تھے اور فون پر ان سے تفصیلی گفتگو ہوتی تھی، سکندر احمد کی ناگہانی موت سے اردو تنقید کو یقیناً نقصان پہونچا ہے۔

اکرم نقاش : اپنے زیرِ طبع ناول نعمت خانہ کے بارے میں کچھ بتایئے، اس کا موضوع کیا ہے؟

خالد جاوید : موضوع بتانا تو بہت مشکل ہے مگر میں آپ کو تھیم ضرور بتا سکتا ہوں، ناول کا تھیم ''کھانا'' ہے نعمت خانہ دراصل ایک قسم کا Food Discourse ہے، وہ تاریخ جو ہم پڑھتے

رہے ہیں اور جس میں انسانی ارتقا کا ایک خاص نظریہ پیش کیا گیا ہے آج اُسے مطلق نہیں مانا جاتا، اس لیے بہت سی Subaltern histories لکھی جا رہی ہیں، یہاں تک Anthropology کے متوازی بھی ایک Subalternanthropology پر بھی غور وخوض ہونا شروع ہو گیا ہے۔ اپنے ناول نعمت خانہ میں، میں نے شاید انسانی تہذیب کی ایک Subalter History لکھنے کی کوشش کی ہے، جس میں ہر شئے کسی نہ کسی طرح آنتوں اور کھانوں سے منسلک ہے، جادو، ٹونا، تنتر منتر، تشدد، جنس اور محبت سب کچھ آخر کار ایک Food Discourse میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ میں اپنی تخلیقات کے بارے میں زیادہ کچھ کہنے کا قائل نہیں اور بہت کچھ ایسا ہوتا ہے جو مجھے خود نہیں معلوم، اس بات کا اقرار میں نے اپنی ہر کتاب کے پیش لفظ میں کیا ہے۔

اکرم نقاش : آپ پہلے نثری نظمیں بھی لکھا کرتے تھے جو اردو کے بہت سے موقر اردو جریدوں میں شائع ہوتی رہیں اب یہ سلسلہ کیوں رک گیا یا ترک ہو گیا؟

خالد جاوید : پتہ نہیں کیوں اب میرا جی نہیں چاہتا اور یہ بھی ہے کہ میری نظمیں بہت اوسط درجے کی تھیں، ۱۹۹۵ کے بعد میں نے کوئی نظم نہیں لکھی۔ شمس الرحمان فاروقی جو میری نظمیں شب خون میں شائع کرتے رہتے تھے انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ بہتر ہے کہ میں صرف افسانہ لکھوں۔ اُدھر پاکستان میں وزیر آغا نے اپنے جریدے ''اوراق'' میں تواتر سے میری نظمیں شائع کی تھیں۔ بہ ہر حال ایک دن اچانک میں نے نظم لکھنا بند کر دیا جس طرح کوئی اچانک سگریٹ پینا بند کر دیتا ہے۔

اکرم نقاش : آپ نے گیبریل گارشیا، مارکیز، میلان کنڈیرا جیسے عالمی ادیبوں پر باقاعدہ کتابیں لکھیں ہیں۔ ان کتابوں کے لکھنے کا بنیادی مقصد کیا ہے؟

خالد جاوید : مقصد اردو کے طلبا کو یا اسکالروں کو ان ادیبوں سے روشناس کرانا تھا، یہ ایک قسم کی ''ریڈرز'' ہیں یعنی تعارفی نوعیت کی کتابیں ہیں، تنقیدی نوعیت کی نہیں ہیں۔ مجھے

کیوں کہ ان ادیبوں سے دل چسپی تھی اس لیے لکھنے میں آسانی ہوئی ۔ میں حوزے، سارا ما گو، پار لاگر کوئست ، بورخیس اور سیلا پر بھی اس قسم کی کتابیں لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں، آج کل میں مغربی فلسفے کی تاریخ پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں جو جلد ہی مکمل ہونے والی ہے۔ ●●

(مطبوعہ اذکار 28۔2015، بنگلور)

(مطبوعہ خبر نامہ شب خون، الہ آباد)